اقامتِ دین

[مطلوبہ اوصاف اور تقاضے]

مولانا سیّد جلال الدین عمری

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اس خاک سار کے مضامین کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'دعوت وتربیت — اسلام کا نقطۂ نظر'، 'یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟' 'ملک و ملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں'۔ ان کے ایک سے زیادہ ایڈیشن نکل چکے ہیں، اب یہ چوتھا مجموعہ 'اقامت دین- مطلوبہ اوصاف اور تقاضے' پیش خدمت ہے۔ اس میں حسبِ ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ اقامتِ دین

۲۔ وما ارسلناك إلّا رحمة للعالمين

۳۔ مطالعۂ سیرت — قرآن کی راہ نمائی میں

۴۔ حالاتِ حاضرہ میں مکّی عہد نبوی سے راہ نمائی

۵۔ علماءِ امت — وارثینِ انبیاء

۶۔ داعیانِ دین کا کردار

۷۔ ذمہ دارانِ جماعت کا ذاتی تزکیہ

۸۔ انابت اِلی اللہ

۹۔ ملک کے حالات اور ہماری ذمہ داری

۱۰۔ اُمتِ مسلمہ سے خطاب

۱۱۔ ملک کے حالات بدلنے کے لیے مسلمان آگے آئیں

۱۲۔ ملکی انتخابات اور اُمتِ مسلمہ کی ذمے داری

ان مضامین میں سے بعض میں تحریک اسلامی کے رفقا سے خطاب ہے، لیکن ان کے مباحث اور مشتملات عام ہیں۔ ان سب ہی مضامین میں قرآن اور سیرت کی روشنی میں امت کے نصب العین کی وضاحت ہے۔ موجودہ حالات میں امت کو اس کی ذمہ داریاں یاد دلائی گئی ہیں اور اس کے لیے مطلوبہ سیرت وکردار کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حقیر خدمت کو شرف قبولیت بخشے اور اس عاجز کو اس کے بہترین اجر سے نوازے۔

برادر عزیز ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کا شکر گزار ہوں کہ حسبِ معمول اس مجموعہ کی ترتیب میں بھی ان کا تعاون حاصل رہا۔ انھوں نے اس کی پروف ریڈنگ کی۔ حسب ضرورت ذیلی سرخیوں کا اضافہ کیا جس سے مضمون بہ یک نظر واضح ہوجاتا ہے۔ میرے معاون مولوی عبدالحاکم مجاہد فلاحی نے ان مضامین کی کمپوزنگ کی اور اس کی تصحیح کی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔

جلال الدین عمری

۱۸/اکتوبر ۲۰۲۰ء

اقامتِ دین

گزشتہ میقات ۱۹-۲۰۱۵ء کے آخر میں کیرلا، مہاراشٹر، تلنگانہ اور بہار کی ریاستوں میں ارکان جماعت اسلامی ہند کے اجتماعات ہوئے۔ان اجتماعات کا ایک موضوع 'اقامت دین' تھا۔اس خاک سار نے اس پر اظہار خیال کیا۔ اس کا مقصد اپنے نصب العین کی یاددہانی تھا۔اسی کو حذف و اضافہ کے بعد مضمون کی شکل میں یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

تحریک اسلامی کا نصب العین اقامتِ دین ہے۔یہ پیغمبرانہ نصب العین ہے۔ اسی کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ (الشوریٰ:۱۳)

اللہ نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کی تاکید اس نے نوح کو کی تھی اور جس کی وحی ہم نے تمھاری طرف کی اور جس کی ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو وصیت کی کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ پیدا کرو۔مشرکین پر وہ چیز شاق گزرتی ہے جس کی تم ان کو دعوت دیتے ہو۔اللہ جسے چاہتا ہے اپنی طرف آنے کے لیے چن لیتا ہے اور راہ دکھاتا ہے ان کو جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

دین کا راستہ اللہ نے دکھایا ہے

شَرَعَ لَکُمۡ (اللہ نے تمھارے لیے راستہ دکھایا ہے) میرے لیے، آپ کے لیے اور ساری دنیا کے لیے۔زور اس پر ہے'اللہ نے راستہ دکھایا ہے'، کسی اور نے نہیں۔'شَرَعَ' کا مصدر شریعت ہے۔شریعت کے لفظ سے ہم سب مانوس ہیں اور اسے عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔شریعت زندگی گزارنے کے اس طریقے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ہر نبی کی ایک شریعت رہی ہے، جس پر عمل کا ان کے ماننے والے کو پابند بنایا گیا تھا۔ لِکُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡکُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا ؕ (المائدۃ:۴۸) (ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور طریقہ رکھا ہے)

ایک اور جگہ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت واقتدار سے نوازا، لیکن وہ اختلافات میں پڑ گئے اور اللہ کے دین کو فراموش کر بیٹھے۔اس کے بعد ارشاد ہے:

ثُمَّ جَعَلۡنٰكَ عَلٰى شَرِيۡعَةٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ فَاتَّبِعۡهَا وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ۝۱۸ (الجاثیۃ:۱۸)

پھر ہم نے اے پیغمبر! تمھیں دین کی ایک شریعت پر لگایا،تم اس کی اتباع کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلو جو جانتے نہیں ہیں۔

یہ یقین ہمارے اندر پوری طرح موج زن ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی ہدایت سے نوازا ہے۔ہم اس راستے پر گام زن ہیں جو اللہ تعالیٰ نے دکھایا ہے۔کسی اور کی راہ نمائی میں ہم اپنا سفرِ حیات نہیں طے کر رہے ہیں۔

فرمایا: شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ، اللہ نے جو راستہ دکھایا ہے وہ دین کا راستہ ہے۔ اللہ کی شریعت کے مطابق جو کچھ ہم کریں گے وہ دین ہوگا۔اس سے انحراف دین نہیں ہوگا۔آپ کی پہچان یہ ہونی چاہیے کہ آپ اللہ کے دین کو لے کر کھڑے ہیں۔اگر آپ رات دن تقریریں کریں، وعظ ونصیحت کریں، مضمون لکھیں، خطاب کریں اور یہ بات ابھر کر نہ آئے کہ آپ اللہ کے دین کی طرف بلا رہے ہیں، تو آپ کی بات ادھوری ہے۔آپ کی

پہچان ہی یہ ہے کہ آپ اللہ کے دین کی طرف بلا رہے ہیں۔اس راستے کی طرف بلا رہے ہیں جس کی راہ نمائی اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔

اقامتِ دین اللہ کے رسولوں کا راستہ ہے

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اقامتِ دین اللہ کے رسولوں کا راستہ ہے۔ یہ حضرت نوحؑ کا راستہ رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ پہلے حاملِ شریعت پیغمبر تھے۔ حضرت آدمؑ کو جو شریعت دی گئی وہ دو ایک احکام پر مشتمل تھی، لیکن حضرت نوحؑ کو باقاعدہ شریعت دی گئی۔ کہا گیا کہ جو دین تمھیں دیا گیا اس کی نصیحت اور تاکید نوحؑ کو کی گئی تھی۔ اس کے بعد اسلوب بدل کر ارشاد ہوا: وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ۔(اور جس کی وحی ہم نے آپ پر کی ہے) یہ ایک وسیع المعنیٰ فقرہ ہے اور اس میں وہ ساری تعلیمات شامل ہیں جو بذریعۂ وحی آپ پر نازل ہوئیں۔اس میں عقیدہ بھی ہے، فکر بھی ہے، عمل بھی ہے، عبادات، اخلاق اور قانون بھی ہے۔دنیا اور آخرت کے سب ہی امور اس کے اندر شامل ہیں، جس کی تفصیل قرآن وحدیث میں موجود ہے۔تفسیر البغوی اور الخازن میں اس کی تشریح میں کہا گیا ہے:من القرآن وشرائع الاسلام یعنی قرآن اور اسلامی شریعت پر، جو آپ پر نازل ہو رہی ہے۔(بغوی مع الخازن:۳۷۶/۵)اس کے بعد ارشاد ہے: وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ۔یعنی اسی اقامت دین کی ابراہیم اور موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام کو وصیت کی گئی تھی۔

اللہ کا دین اصول وکلیات میں ہمیشہ ایک رہا ہے۔ البتہ زمانے کے لحاظ سے شریعتیں مختلف رہی ہیں۔جس سیاق میں یہ بات آئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ایک جامع شریعت عطا ہوئی ہے۔سابقہ شریعتوں کی بنیادی تعلیمات اور اصولی احکام اس میں پائے جاتے ہیں۔

یہ سوچ کر آپ کا دل جذباتِ مسرت سے معمور ہونا چاہیے کہ آپ نے وہ راستہ

اختیار کیا ہے جو حضرت نوحؑ کا راستہ تھا، حضرت محمد ﷺ کا راستہ تھا، حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کا راستہ تھا۔ ایک تو وہ راستہ ہے جس پر ساری دنیا چل رہی ہے۔ برے بھلے سب ہی لوگ دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ دوسرا وہ راستہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر گام زن رہے ہیں۔ غور کیجیے کہ آپ کو کتنی بڑی دولت ملی ہے اور کتنا بڑا سرمایہ آپ کے پاس ہے؟ ان سب پیغمبروں کو حکم دیا گیا تھا: اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ ۔ اس کا ترجمہ 'دین پر قائم رہو' کیا گیا ہے اور 'دین قائم کرو' بھی کیا گیا ہے۔ دونوں ترجمے صحیح ہیں۔ آدمی دین پر قائم رہے گا تو دین قائم بھی کرے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص دین پر قائم رہے اور دین کو قائم نہ کرے۔ دین قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اللہ کے دین کو قبول کیا ہے، آپ بھی قبول کیجیے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی چپ چاپ اللہ کے دین کو اختیار کرلے اور کسی سے اس کا اظہار نہ کرے۔ بیوی، بچوں اور پڑوسیوں تک سے اس کا ذکر نہ کرے۔ یہ کون سا دین پر عمل کرنا ہے؟ جو انسان کی زبان بندی کردے اور جسے وہ حق سمجھ رہا ہے اس کے اظہار و اعلان کی اجازت نہ دے۔ اقامتِ دین کا آغاز ہی دعوت دین سے ہوتا ہے۔[1]

دین پر چلنے میں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے

قرآن نے اہل کتاب کے بارے میں کہا:

وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اَقَامُوا التَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ لَاَكَلُوۡا مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَمِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِهِمۡ ؕ (المائدۃ:٦٦)

اگر اہل کتاب توریت اور انجیل کو اور ان کے رب نے ان کی طرف جو نازل کیا ہے (قرآن) اسے قائم کریں تو اپنے اوپر سے اور اپنے نیچے سے خوب کھاتے۔

---

(۱) اقیموا الدین کی تشریح میں مشہور سلفی عالم شیخ عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی کہتے ہیں: أی أمرکم أن تقیموا جمیع شرائع الدین أصوله وفروعه، تقیمونه بأنفسکم وتجتهدون فی اقامته علی غیرکم۔ تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسیر کلام المنان، مطبوعہ ریاض، ص۔ ۸۸۸
(اس نے تمھیں حکم دیا ہے کہ تم دین کے تمام احکام اس کے اصول و فروع کو قائم کرو۔ تم انھیں اپنے اوپر قائم کرو اور دوسروں پر بھی قائم کرنے کی کوشش کرو۔)

مطلب یہ کہ اگر وہ اللہ کے دین کو تھام لیں تو آسمان سے نعمتیں برسیں گی اور زمین اپنے خزانے اگل دے گی۔ یہی بات ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان اور زمین سے برکتوں کے (دروازے) ان پر کھول دیتے۔ (الاعراف:۹۶)

نادان انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ پر ایمان اور اس کے دین پر عمل کرنے سے اس کی دنیا تباہ ہوجائے گی۔ فرمایا: تم نے سمجھا کیا ہے خدا کے دین کو؟ اس پر عمل کرنے سے تو اللہ کی نعمتیں برستی ہیں، لیکن تم ہو کہ گھبرا رہے ہو۔ آج بھی بہت سے نام نہاد دانش ور کہتے ہیں کہ دین اور اس کی تعلیمات دنیوی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ان پر عمل کر کے موجودہ دور میں ہم ترقی نہیں کرسکتے۔ قرآن نے اس کی تردید کی ہے۔ توریت اور انجیل پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول پر ایمان لائیں اور اس کی دوسروں کو نصیحت کریں۔ اقامت دین کا اولین مرحلہ تبلیغِ دین ہے۔

ہماری دعوت پُرامن ہے

آگے ارشاد ہے: كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ۔ جو لوگ مبتلائے شرک ہیں اور جن کا پورا نظام مشرکانہ ہے، آپ کی دعوت ان پر شاق گزر رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک دعوت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ دنیا میں مطلوبہ تبدیلی کس طرح لائیں گے؟ اس کا جواب اس میں موجود ہے۔ اس میں کہا گیا ہے: كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ۔ جس دین کی تم دعوت دے رہے ہو مشرکین پر وہ شاق گزر رہی ہے۔ اسے وہ برداشت نہیں کر رہے ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو تبدیلی چاہتے ہیں وہ دعوت کے ذریعہ آئے گی۔ آگے فرمایا: اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ۔ ''اللہ جسے چاہتا ہے پیغمبری سے سرفراز کرتا ہے اور جو اللہ کی طرف آنا چاہتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے۔'' اس سے

ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ اس کے قبول کرنے کے لیے کوئی جبر نہیں، کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے۔ اس کا اختیار اللہ کے رسول کو بھی نہیں ہے۔ قرآن نے صاف الفاظ میں کہا ہے:

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٥٦﴾ (القصص:۵۶)

اے نبی! تم جسے چاہو ہدایت نہیں دے سکتے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت پانے والے ہیں۔

سورۂ شوریٰ کی مذکورہ آیت میں امت کا نصب العین اور اس کے طریقۂ کار دونوں کا بیان ہے۔ اقامت دین، عقیدہ اور عمل کی دنیا میں بہت بڑی تبدیلی چاہتا ہے لیکن یہ تبدیلی آئے گی ذہن وفکر کی تبدیلی سے۔ اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں اختیار کیا جائے گا۔ یہ ہمارے نصب العین اور ہمارے دستور کے بھی خلاف ہوگا۔ اگر کوئی شخص اس سے ہٹ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے تو ہم اس سے براءت کا اعلان کرتے ہیں۔ ہمارا راستہ دعوت الی اللہ کا ہے۔ دعوت سے مراد یہ ہے کہ ہم اللہ کا دین دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور اس پر غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کے ردّ وقبول میں وہ آزاد ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ اللہ کے دین کو اس کے بندے مستقل رد نہیں کرسکیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں کچھ وقت لگے، لیکن یہ سعی رائیگاں نہیں جائے گی۔ آج کے حالات میں ضروری ہے کہ آپ کی طرف سے یہ بات وضاحت کے ساتھ آئے اور لوگوں کو معلوم ہو کہ آپ اس ملک میں جو سعی وجہد کررہے ہیں وہ پرامن سعی وجہد ہے۔

اقامتِ دین کا وسیع تصور

اس آیت میں بالکل واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ اللہ کے رسولوں کو 'اقامتِ دین' کی تاکید کی گئی تھی اور امت سے کہا گیا ہے کہ وہ اس پر عمل پیرا ہو۔ اقامتِ دین کا تصور بڑا وسیع ہے۔ اس میں شخصی اور انفرادی زندگی سے لے کر تمام اجتماعی امور شامل

ہیں۔ اقامت دین یہ ہے کہ فرد کی نشو ونما، اس کی فکری و عملی تربیت، خاندان کی تشکیل، معاشرے کی اصلاح، تہذیب وتمدن اور قانون وسیاست سب اللہ کے دین کے تابع ہو اور حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ اس سے آزاد نہ رہے۔ اقامتِ دین کے اس وسیع تصور سے بعض حضرات کو اختلاف ہے، لیکن اس اختلاف کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے۔

اللہ کے رسولوں کی بعثت جس مقصد کے لیے ہوتی ہے، قرآن میں اس کے لیے متعدد اصطلاحات اور تعبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ کہیں کہا گیا: یہ 'دعوت الی اللہ' ہے، کہیں اسے 'شہادت علی الناس' قرار دیا گیا، کہیں اسے انذار وتبشیر سے تعبیر کیا گیا، کہیں جہاد فی سبیل اللہ، اعلاء کلمۃ اللہ اور اظہار دین فرمایا گیا۔ کہیں اسے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا عنوان دیا گیا۔ ان اصطلاحات میں سے کسی میں بعثت انبیاء کا ایک پہلو اور کسی میں دوسرا پہلو نمایاں ہے۔ ان سب پر مجموعی غور وفکر سے بعثت انبیاء کا مقصد بخوبی واضح ہوتا اور اس کا وسیع اور جامع تصور سامنے آتا ہے۔(۱)

اللہ تعالیٰ کے دین کا تعلق ہماری شخصی زندگی سے بھی ہے اور حیاتِ اجتماعی سے بھی، لیکن دورِ حاضر اجتماعی زندگی میں مذہب کے عمل دخل کا مخالف ہے۔ اسے اصرار ہے کہ مذہب کو شخصی زندگی تک محدود رکھا جائے۔ آپ نماز پڑھ رہے ہیں، پڑھیے۔ چار رکعت پڑھ رہے ہیں، چالیس رکعت پڑھیے، اس سے کوئی بحث نہیں ہے۔ آپ خورد ونوش اور کھانے پینے میں حلال وحرام کے پابند ہیں شوق سے ان کے پابند رہیے۔ جن سماجی اور معاشرتی آداب کو ملحوظ رکھنا چاہتے ہیں، خوشی سے ان کا لحاظ کیجیے۔ اس کی بھی گنجائش ہے کہ آپ اپنے طریقہ سے نکاح وطلاق پر عمل کریں، لیکن اجتماعی اور سیاسی زندگی میں مذہب کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ پوری دنیا اس پر متفق ہے کہ مذہب کا تعلق انسان کی شخصی زندگی سے ہے۔ اجتماعی معاملات کو اس سے آزاد ہونا چاہیے۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ حیاتِ اجتماعی

---

(۱) راقم نے ان اصطلاحات پر قرآن مجید کی روشنی میں 'تجلیات قرآن' اور بعض دوسری کتابوں میں بحث کی ہے۔

کو بھی اسلام کے تابع ہونا چاہیے، جس خدائے برتر کے لیے ہم نماز پڑھ رہے ہیں، روزہ رکھ رہے ہیں، زکوٰۃ دے رہے ہیں، حج کرتے ہیں اور اپنے گھر کا نظام بھی چلا رہے ہیں، اسی کو اجتماعی زندگی میں حکم راں ہونا چاہیے۔تو ہر طرف سے آپ کی مخالفت شروع ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وہ کیسا قانون ہے کہ آپ گھر میں تو اس پر عمل کریں اور باہر خود مختار اور آزاد رہیں۔

اسلام ظلم و جبر کا خاتمہ چاہتا ہے

آج کا ایک معروف اور مقبول نعرہ یہ ہے کہ اسلام انسان کو بنیادی حقوق فراہم نہیں کرتا، اس کے ہاں مساوات نہیں ہے اور سب کے لیے عدل و انصاف نہیں ہے، اس سے آگے الزام یہ ہے کہ اسلام معاشرے میں دہشت گردی پھیلاتا اور فساد کی راہ دکھاتا ہے۔ یہ پروپیگنڈہ اس زور اور قوت سے کیا جاتا ہے کہ یہ سمجھنے میں دقت پیش آ رہی ہے کہ اسلام ہر طرح کے ظلم و عدوان کا خاتمہ چاہتا ہے اور ہر چھوٹے بڑے کو عدل و انصاف فراہم کرتا ہے۔

اعتراض کرنے والے وہ ہیں جن کے ہاتھوں پہلی جنگ عظیم میں دو کروڑ اور دوسری جنگ عظیم میں گیارہ کروڑ افراد ہلاک ہوئے۔ دنیا نے اس سے زیادہ تباہی نہیں دیکھی تھی۔کیا یہ جنگیں اسلام کے لیے لڑی گئیں؟ وہاں تو اسلام کیا، کوئی بھی مذہب زیر بحث نہیں تھا۔ یہ قومی برتری اور اقتدار کی جنگیں تھیں۔

اس وقت مشرق وسطیٰ اور مسلم ممالک میں مغرب اور اس کی حلیف طاقتیں جس خوں ریزی کا ارتکاب کر رہی ہیں، کیا اس کی تعلیم اسلام نے دی ہے اور اسلام کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے؟ ہر ایک جانتا ہے کہ یہ سب کچھ ان ممالک کے وسائل پر قبضے اور ان پر سیاسی تسلط کے لیے ہے۔اس کی مزاحمت کہیں سے ہوتی ہے تو دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے۔

اسلام دنیا سے ظلم اور فساد کو مٹانے کے لیے آیا ہے۔اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے، اس کی یہ آزادی باقی رہنی چاہیے۔ اگر یہ آزادی

سلب کر لی جائے تو اس کا وجود جمادات، نباتات اور جانوروں کی طرح ہوگا، جو آزادی سے محروم ہیں یا محدود دائرے میں آزادی رکھتے ہیں۔اسلام انسان کی آزادی کے ساتھ اس کے بنیادی حقوق کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔اسی اسلام کی اقامت کی ہم دعوت دیتے ہیں۔

میرے دوستو اور ساتھیو! آپ کو اللہ کے نازل کردہ دینِ اسلام پر اور اس بات پر کہ اسی دین کے آپ حامل ہیں اور یہ وہ راستہ ہے جو پیغمبروں نے ہمیں دکھایا ہے۔یقین ہونا چاہیے، ایسا یقین جو آپ کے لفظ لفظ سے ابل رہا ہو۔آپ کا بدترین مخالف بھی یہ نہ کہے کہ عوام کو متاثر کرنے کے لیے خدا اور مذہب کے نام پر ایک نیا نعرہ بلند کیا جا رہا ہے۔ سننے والا کہے کہ ایک خیر خواہ انسان بول رہا ہے۔یہ ایک دردمند دل کی آواز ہے۔اس سے بے رخی نہیں اختیار کی جاسکتی۔اس پر توجہ ہونی چاہیے۔اللہ سے دعا ہے کہ اس وقت جو باتیں عرض کی گئی ہیں اسے میں بھی اور آپ بھی دل و دماغ میں تازہ رکھیں اور اپنی طاقت کی حد تک عمل کی کوشش کریں۔اللہ تعالٰی میری اور آپ کی مدد فرمائے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ

کویت میں کام کرنے والی ہندستانی مسلمانوں کی رفاہی تنظیم 'انڈین مسلم ایسوسی ایشن' (IMA) کی دعوت پر مولانا سید جلال الدین عمری، صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی وامیر جماعت اسلامی ہند نے کویت میں ایک عشرہ گزارا۔ جناب عبداللہ منہام (کیرلا) رفیقِ سفر تھے۔ اس تنظیم کی تاسیس کے پچیس برس مکمل ہونے پر اس نے سیرت نبویؐ کے مرکزی موضوع پر تین ماہ پر مشتمل بہت سے پروگرام کیے تھے۔ اس کے اختتامی پروگرام میں بہ طور مہمان خصوصی مولانا عمری کو دعوت دی گئی تھی۔ اس پروگرام کے تحت ۳۰ر نومبر ۲۰۱۸ کو علماء کانفرنس ہوئی، جس میں کویت میں مقیم مختلف مکاتبِ فکر کے ہندستانی علما شریک ہوئے۔ اس میں مولانا نے 'موجودہ حالات میں علماء کا مطلوبہ کردار' کے عنوان پر خطاب کیا۔ اسی شب میں ایسوسی ایشن کا اختتامی پروگرام 'مسجد کبیر' کے وسیع ہال میں ہوا، جس میں کئی ہزار افراد کی شرکت رہی۔ اس میں مولانا نے 'وماارسلناک الا رحمۃ للعالمین' کے عنوان پر خصوصی خطاب

کیا۔ذیل میں مولانا کا وہ خطاب پیش کیا جارہا ہے(محمد رضی الاسلام ندوی)

بزرگو، دوستو اور عزیزو، محترم خواتین! ماؤ، بہنو اور بیٹیو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر خیر کی یہ مجلس ہے۔آپ کی عظمت اور فضیلت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴿۵۶﴾

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے اس نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم بھی ان کے لیے دعائے رحمت کرو اور اچھی طرح سلام بھیجو۔ (الاحزاب:۵۶)

اس سے بڑی بات کیا کہی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی دعائیں آپ کے شامل حال رہی ہیں اور اہل ایمان کو بھی اس کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔اللھم صل علیٰ سیدنا محمد الخ

بلغ العلیٰ بکمالہ کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ صلوا علیہ و آلہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی روشن چراغ ہے

اللہ تعالیٰ نے آپ کو 'سراج منیر' کہا ہے:

وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا﴿۴۶﴾

اے نبی! ہم نے آپ کو اللہ کی طرف اس کے اذن سے بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔ (الاحزاب:۴۶)

آپ آفتابِ عالم تاب ہیں۔آفتاب کسی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا۔اس کا وجود خود اس کی دلیل ہے۔آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بہت سے دلائل ہیں۔ایک بڑی اور واضح دلیل آپ کی پاکیزہ سیرت ہے، جو آپؐ کی رسالت کی شہادت دیتی ہے۔آپ کا کردار اتنا بلند تھا کہ آپ سے کذب بیانی وافترا پردازی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔اس لیے آپ کو 'سراج منیر' (آفتابِ ضیابار) کہا۔

آفتاب اپنی جگہ روشن ہے اور کرۂ ارض کو روشن رکھے ہوئے ہے۔ اسی طرح آپؐ کے اوصافِ حمیدہ آفتاب کی طرح روشن ہیں اور دنیا کو رشد و ہدایت بھی آپ ہی سے مل سکتی ہے۔ آپؐ 'خاتم النبین' ہیں۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ (الاحزاب:۴۰)	محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم (آخری نبی) ہیں۔

آپؐ کے بعد سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا۔ اب تا قیامت آپ پر ایمان اور اتباع ہی کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا واحد ذریعہ قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ کسی بھی دوسرے ذریعہ سے انسان کو اللہ کی ہدایت مل سکتی ہے اور نہ اس تک رسائی کی کوئی دوسری سبیل ہے۔

آپؐ کی اتباع تمام مسلمانوں پر لازم ہے

اللہ تعالیٰ سے تعلق اور محبت کے لیے آپ کی اتباع کو لازم قرار دیا گیا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱ (آل عمران:۳۱)	کہہ دو۔ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور اللہ غفور رحیم ہے۔

دین اسلام کے کامل اتباع، اس کے احکام کی پابندی، اس کی تبلیغ واشاعت کے لیے سعی وجہد اور ہر طرح کی قربانی کیسے دی جاتی ہے اور کس طرح استقامت کا ثبوت دیا جاتا ہے، اس کا مثالی نمونہ رسول اکرم ﷺ کی ذات اقدس تھی۔ اب جو شخص بھی اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے یہی اسوۂ حسنہ ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝۲۱ (الاحزاب:۲۱)	تمھارے لیے رسول اللہ کی ذات میں بہترین اسوہ ہے۔ ہر اس شخص کے لیے جو اللہ سے اجر و ثواب کی توقع اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور جو کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے۔

جو شخص آپ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھے گا وہی اللہ تعالیٰ کے دین کا حق ادا کر سکے گا اور دنیا و آخرت میں فوز و فلاح سے ہم کنار ہوگا۔

اس موقع پر حیات مبارکہ کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت عامّہ

اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے۔ اس کی رحمت ہر سو عام ہے۔ اسی سے یہ دنیا آباد ہے۔ یہاں کی ہر مخلوق زبان حال سے اس کے رحمٰن و رحیم ہونے کا اعلان کرتی ہے کہ اس کی رحمت نہ ہو تو اس کا وجود ہوگا اور نہ اسے زندگی نصیب ہوگی۔ اس کی حیات کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مرہونِ منت ہے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان و یقین آدمی کو اسی حقیقت کے اعتراف پر مجبور کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ایک مسلمان، کوئی بھی کارِ خیر شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم کے مقدس کلمات زبان سے ادا کرتا ہے۔ یعنی اس کام کا آغاز اور اس کا اپنے انجام کو پہنچنا سب اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ سورۂ فاتحہ کا آغاز بھی اسی سے ہوا ہے۔ الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم۔ ہماری تمام تر حمد و ثنا اور سارے جذباتِ شکر کا سزاوار اللہ ہے، جو رب العالمین ہے۔ رب وہ ہے، جو اپنی مخلوقات میں سے ہر ایک کی حاجت پوری کرتا ہے اور اس کی اس طرح پرورش کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اس وقت تک اپنا وجود باقی رکھے اور اپنا کام انجام دیتی رہے، جب تک اللہ چاہے۔ یہ سب اس کے رحمان و رحیم ہونے کی دلیل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین بن کر آئے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ (الانبیاء:۱۰۷) آپ نے دنیا کو بتایا کہ اللہ رحمٰن و رحیم ہے۔ اس کے بندوں کو بھی ایک دوسرے کے ساتھ رحمت و رافت کا معاملہ کرنا چاہیے اور ان کی زندگی خدائی اوصاف کا پرتو ہونی چاہیے۔ اسی سے وہ خدا کے محبوب بن سکتے ہیں۔

رحم وکرم کا پاکیزہ جذبہ اگر دل میں جاگزیں ہوجائے تو انسانوں کے درمیان پیدا ہونے والے سارے نزاعات ختم ہوجائیں اور دنیا امن وسکون کا گہوارہ بن جائے۔

رسول اللہ ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے کے بعض دوسرے پہلو یہ ہیں:

۲۔ بشارت اور انذار

رسول اللہ ﷺ اللہ کی طرف سے بشیر ونذیر تھے:

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿١٠٥﴾ (بنی اسرائیل:۱۰۵)

یہ کتاب ہم نے حق کے ساتھ نازل کی ہے اور وہ حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ ہم نے تو آپ کو مبشر ونذیر ہی بنا کر بھیجا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٨﴾ (الفتح:۸)

ہم نے آپ کو حق کی شہادت دینے والا اور بشارت دینے اور ڈراوا سنانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق اور بے تعلقی کے نتائج سے دنیا بے خبر تھی۔ آپؐ نے بتایا کہ اللہ سے رشتہ توڑ کر انسان فلاح نہیں پا سکتا۔ اس کے لیے کام یابی کے سارے راستے بند ہیں۔ انسان کے دنیا اور آخرت میں بامراد اور سرخ رو ہونے کا ایک ہی راستہ ہے، وہ یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کی راہ اختیار کرے۔ جو قوم اس پر گام زن ہوگی اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت کی مستحق ہوگی اور دنیا کی امامت وقیادت کی زمام کار اس کے ہاتھ میں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں افراد اور اقوام کا دائمی خسران ہے۔ اس سے ان کی قسمت میں ہمیشہ کی تباہی لکھ دی جائے گی۔ یہ وہ انذار وتبشیر کا فرض ہے جو آپ کے ذریعہ انجام پایا۔ یہ آپ ﷺ کا اتنا بڑا احسان ہے کہ دنیا کبھی اس سے سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ آج بھی انسان اپنی ہزار مادی ترقی کے باوجود گم کردہ راہ اور خدا سے بھٹکا ہوا ہے۔ وہ اس بات کا محتاج ہے کہ محمد ﷺ نے جو صراط مستقیم دکھائی ہے، اس کی طرف اس کی راہ نمائی کی جائے اور اسے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا مستحق بنایا جائے۔

۳۔ وحدتِ بنی آدم کا تصور

رسول اللہ ﷺ نے وحدت بنی آدم کا تصور دیا۔ دنیا قوموں، طبقوں، گروہوں میں منقسم تھی۔ کہیں جغرافیائی حدود، کہیں قومی، نسلی اور لسانی فرق اور کہیں غلط قسم کے مذہبی رسوم و رواج نے انسانوں کو تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کئی طرح کی دیواریں حائل تھیں۔ اپنے اور غیر کا فرق دوستی اور دشمنی کی بنیاد تھا اور اسی پر اس کے ساتھ سلوک کیا جاتا۔ نزاعات ہوتے، میدانِ کارزار گرم ہوتے، خون کے دریا بہتے اور انسانیت یہ دیکھ دیکھ کر شرم سار ہوتی کہ ہر کسی کا دامن اپنے ہی جیسے انسان کے خون سے رنگین ہے۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول محمد ﷺ نے اعلان کیا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾ (الحجرات: ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھارے خاندان اور قبائل بنادیے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں سب سے زیادہ باعزت اللہ کے نزدیک وہ ہے، جو سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا اور باخبر ہے۔

تم سب ایک ماں باپ کی اولاد ہو۔ یہ تمھارے قبیلے اور خاندان جنگ و جدال کے لیے نہیں، باہم تعارف کے لیے ہیں۔ تم چاہے مشرق میں ہو یا مغرب میں، شمال میں ہو یا جنوب میں، تم کالے ہو یا گورے، تم کوئی بھی زبان بولتے ہو، تم سب ایک ہو۔ ایک ماں باپ کی اولاد ہو۔ پھر تمھارے درمیان عداوت کیوں ہے؟ تم کیوں ایک دوسرے کے درپے آزار اور خون کے پیاسے ہو، تم سب برابر ہو، سب کے حقوق مساوی ہیں، کوئی کسی سے برتر نہیں۔ ہاں وہ شخص قابل احترام ہے، جس کے دامن میں تقویٰ کی دولت ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈر کر زندگی گزارتا ہے۔ جو تقویٰ میں جتنا آگے ہوگا اتنا ہی عزت و

احترام کے قابل ہوگا۔

خطبۂ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ سے زیادہ جاں نثاروں کے درمیان آپؐ نے اعلان فرمایا: ''یاد رکھو کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو عربی پر، کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ فضیلت اور برتری اسے حاصل ہے جس کے اندر تقویٰ اور خدا ترسی ہے۔'' (احمد)

۴۔ حسنِ اخلاق کی تکمیل

دنیا میں بہت سے معلم اخلاق گزرے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اخلاق کی تعلیم کو اس کی آخری بلندی تک پہنچایا۔ آپ کا ارشاد ہے: بُعِثتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الأَخلَاقِ۔ (مؤطا) ''میری بعثت اس لیے ہوئی ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔'' آپ نے محبت و رافت، عفو و درگزر، صبر و تحمل، تواضع اور انکسار، فراخ دلی اور سخاوت، صداقت اور راست بازی، عدل وانصاف، عفت و عصمت، شرم وحیا جیسی اعلیٰ صفات پر زور دیا اور ان کے برعکس اوصاف، نفرت اور عداوت، غیظ و غضب، بے جا انتقام، تکبر اور نخوت، بخالت اور تنگ دلی، جھوٹ اور کذب بیانی، ظلم اور ناانصافی، بدکاری اور بے حیائی جیسی ناپسندیدہ اوصاف سے سختی سے منع کیا۔

اعلیٰ اخلاق اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوش نودی کا ذریعہ ہیں۔ یہ دنیا میں انسان کو رفعت و بلندی عطا کرتے ہیں۔ اس سے سماج میں عزت واحترام حاصل ہوتا ہے اور انسان معاشرے کے لیے ایک بہتر اور مفید تر فرد ثابت ہوتا ہے۔ بداخلاق شخص اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مبغوض ہے۔ اسے دنیا میں عزت واحترام سے نہیں دیکھا جاتا اور سماج کے لیے اس کا وجود تکلیف دہ اور ضرر رساں ہوتا ہے۔ ہر شخص اس سے نفرت کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا احسان ہے کہ معاشرے میں حسن اخلاق کا فروغ ہوا اور بداخلاقی جرم سمجھی جانے لگی۔

۵۔حقوقِ انسانی کی حفاظت

رسول اللہ ﷺ نے کم زور افراد اور طبقات، عورتوں، بچوں، مسکینوں، یتیموں اور محکوموں سے بہتر سلوک کی ترغیب دی اور ان کے ساتھ غیر اخلاقی رویہ اختیار کرنے سے سختی سے منع فرمایا۔اس پر اللہ تعالیٰ کی وعید سنائی۔آج دنیا کم زوروں اور مظلوموں کے حقوق کا اظہار اور اعلان کرتی ہے اور اس کے لیے قوانین بھی وضع کیے جاتے ہیں۔بہت سے لوگ اس کا سہرا دورِ حاضر کے سر باندھتے ہیں،لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشرے کے کم زور اور بے بس انسانوں کے حق میں سب سے پہلے آواز اٹھانے اور ان کے حقوق کی حفاظت وصیانت کے لیے اقدامات کرنے کا اعزاز اللہ کے رسول ﷺ ہی کو حاصل ہے۔

دنیا آپ کے ان احسانات کا اعتراف کرتی ہے۔کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ اس سطح کا کوئی دوسرا مذہبی یا سیاسی قائد چشم فلک نے نہیں دیکھا۔لیکن اس دنیا میں وہ لوگ بھی ہیں، جو آپ کو ایک ایسے جنگ جو اور تشدد پسند کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں جو مخالفین کو برداشت نہیں کرتا اور انھیں تہِ تیغ کرنے میں اسے تامل نہیں ہوتا۔کہا جاتا ہے کہ آج کی دنیا میں جہاں کہیں مذہبی تشدد پایا جاتا ہے،اس کے پیچھے آپ کا فکر اور طرزِ عمل کارفرما ہے۔یہ ایک صریح الزام اور اتہام ہے۔رسول اللہ ﷺ کی سیرت مقدسہ اور آپ کی تعلیمات سے اس کی صاف تردید ہوتی ہے۔یہاں دو ایک پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے:

خواتین ہر دور میں مردوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنتی رہی ہیں۔وہ خاندان پر بوجھ بن کر رہتیں۔ان کا معیارِ زندگی پست تھا، روکھی سوکھی پر جیسے تیسے زندگی بسر کرتیں۔آپؐ نے مردوں کو جو، ان کے قوّام ہیں ہدایت فرمائی کہ ”تم جو کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ، جو پہنو وہ ان کو پہناؤ، انھیں زدوکوب نہ کرو اور برا بھلا مت کہو۔“ (ابوداؤد) ایک اور موقع پر فرمایا: ”سب سے زیادہ کامل ایمان اس شخص کا ہے،جس کے اخلاق اچھے ہوں۔تم میں بہتر وہ ہیں، جو بیویوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آئیں اور ان سے بہتر سلوک کریں۔“ (ابوداؤد، ترمذی) مطلب یہ کہ اعلیٰ

اخلاق کا ثبوت سب سے پہلے اپنے گھر میں دینا چاہیے۔ایک اور موقعہ پر فرمایا: خَیرُکُم خَیرُکُم لِأَھلِہِ، وَأَنَا خَیرُکُم لِأَھلِی۔(ترمذی) ''تم میں بہتر انسان وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہے۔اگر میرا اسوہ چاہتے ہو تو جان لو! میں اپنے گھر والوں کے حق میں تم سے بہتر سلوک کرتا ہوں۔''

غلام اور محکوم دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم تھے۔ان کے کچھ تسلیم شدہ حقوق نہیں تھے۔وہ اپنے آقا کے رحم وکرم پر زندگی گزارتے تھے۔آپ نے ان کے بارے میں جواب دہی کا تصور دیا اور کہا کہ ان کے ساتھ ظلم وزیادتی پر کل قیامت کے روز اللہ کے ہاں باز پرس ہوگی۔اس تصور نے غلاموں کی آزادی کی راہ ہموار کی۔

حضرت ابومسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہا تھا۔پیچھے سے آواز سنی۔''ابومسعود! خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنی کہ تمھیں اس پر حاصل ہے۔'' پلٹ کر دیکھا تو رسول اللہ ﷺ موجود تھے، میں نے کوڑا زمین پر ڈال دیا اور کہا کہ اس کے بعد کسی غلام کو کبھی نہیں ماروں گا اور یہ غلام آج سے آزاد ہے۔آپؐ نے فرمایا: ''اگر تم اسے آزاد نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمھیں چھو جاتی۔'' (مسلم)

دشمنوں کے ساتھ آپ کے سلوک کی ایک مثال پیش کی جارہی ہے:

مکہ فتح ہوا تو وہ لوگ جنھوں نے آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے، اپنا وطن عزیز مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا، جو ہمیشہ آپ کے خلاف محاذ آرا رہے اور جن سے آپ کو کئی جنگیں کرنی پڑیں وہ آپ کے سامنے نگوں سار کھڑے تھے۔آپ چاہتے تو ان میں سے ایک ایک سے بدلہ لے سکتے تھے۔آپ نے ان سے سوال کیا: بتاؤ اب میں تمھارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟ وہ دشمن ہونے کے باوجود آپ کی سیرت وکردار سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے کہا: آپ شریف انسان ہیں اور شریف بھائی کی اولاد ہیں۔آپ نے فرمایا: جاؤ آج تم سب آزاد ہو۔تم سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ یہ اعلان سنتے ہی انھیں یوں محسوس ہوا جیسے موت کے منہ سے نکل آئے ہوں۔اس کے بعد وہ سب اسلام میں داخل ہوگئے۔اپنے مخالفین پر قابو پانے کے بعد خون آشامی کی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے، لیکن کیا انتقام کی جگہ عفو ودرگزر کا کوئی اور نمونہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے؟

مطالعۂ سیرت

[قرآن کی راہ نمائی میں]

۱۰، ۱۱؍ مارچ ۲۰۱۸ کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کے اشتراک سے 'موجودہ دور میں ہندستان میں سیرت نگاری' کے موضوع پر دوروزہ سمینار منعقد کیا تھا۔ اس کے افتتاحی اجلاس میں راقم نے 'مطالعۂ سیرت۔ قرآن کی راہ نمائی میں' کے عنوان سے مضمونِ ذیل پیش کیا۔

اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید اور جس مقدس ہستی پر وہ نازل ہوا، اس کی سنت امت مسلمہ کی فکری اساس بھی ہیں اور عملی اساس بھی۔ اس نے ان ہی دو سرچشموں سے فیض حاصل کیا ہے اور ان ہی کی راہ نمائی کو اپنے لیے قابل اعتماد راہ نمائی تصور کیا ہے۔ تمام اسلامی علوم کی بنیاد ان ہی دو اساسات پر ہے۔ خواہ اس کا تعلق تفسیر قرآن و شرح حدیث سے ہو، فقہ سے ہو، عقیدہ و کلام سے ہو، تاریخ سے ہو، تصوف اور اخلاق سے ہو یا حکمت و معرفت سے۔ اس سے آگے طبعیات یا فزیکل سائنس، ریاضی، جغرافیہ، طب کے علوم کا محرک بھی کسی نہ کسی رخ سے ان ہی کی خدمت رہا ہے۔

مجھے رسول خدا ﷺ فداہ امی وابی کی سیرت سے متعلق کچھ عرض کرنا ہے، لیکن خوف دامن گیر ہے، اس لیے کہ آپ کی سیرت بیان واقعات ہی نہیں، بلکہ امت کی راہ نمائی بھی ہے۔ آپ کے نقوش قدم کی تلاش و جستجو ہے تا کہ ان کی اتباع کی جائے۔ اس لیے پھونک کر قلم کو جنبش دینی پڑتی ہے۔ع

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

سیرت رسول کا سب سے مستند اور سب سے معتبر ماخذ قرآن مجید ہے۔ اس کا بیان قولِ فیصل ہے۔ اس کی تائید میں ہم دوسرے مآخذ سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں، بلکہ کرنا چاہیے۔ قرآن مجید نے حیاتِ مبارکہ کے مختلف پہلوؤں کا کہیں اشاروں میں اور کہیں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس سے آپ کی بڑی حسین اور بڑی جامع تصویر ابھرتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں کہا ہے اور بالکل صحیح کہا ہے کہ قرآن مجید کے سوا کوئی دوسرا ماخذ سامنے نہ ہو تو بھی آپ کی سیرت مرتب ہو سکتی ہے، لیکن مولانا کے علمی ذخیرے میں اس نوع کی سیرت ہمیں نہیں ملتی۔ ان کے علمی منصوبوں میں یہ کارِ خیر شاید شامل نہیں ہو سکا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا ایک مضمون 'تفہیمات' (حصہ دوم) میں شامل ہے۔ عنوان ہے 'قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے؟' اس میں مولانا نے بتایا ہے کہ دنیا میں جتنے بانیانِ مذاہب رہے ہیں انھوں نے خود کو پروردگار عالم یا اس کا قائم مقام قرار دیا ہے۔ یا ان کے ماننے والوں نے انھیں اس مقام تک پہنچا دیا ہے، لیکن قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروں کے بارے میں، خاص طور پر اپنے لانے والے کے بارے میں بار بار صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ آپ بشر ہیں اور منصب رسالت کی وجہ سے آپ کا مقام بشریت سے بلند نہیں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> ''اگر اسلامی لٹریچر کی دوسری تمام کتابیں دنیا سے ناپید ہو جائیں اور صرف قرآن مجید ہی باقی رہ جائے تب بھی رسول اکرم ﷺ کی شخصیت کے متعلق کسی غلط فہمی، کسی شک وشبہ اور کسی لغزشِ عقیدت کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ ہم اچھی

طرح معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کتاب کا لانے والا ایک کامل انسان تھا، بہترین اخلاق سے متصف تھا، انبیاء سابقین کی تصدیق کرتا تھا، کسی نئے مذہب کا بانی نہ تھا اور کسی فوق البشر حیثیت کا مدعی نہ تھا۔ اس کی دعوت تمام عالم کے لیے تھی، اس کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے چند مقرر خدمات پر مامور کیا گیا تھا اور جب اس نے خدمات کو پوری طرح انجام دے دیا تو نبوت کا سلسلہ اس کی ذات پر ختم ہو گیا۔'' (ص ۳۸)

یہ ایک قابل قدر علمی کاوش ہے، لیکن اس سے سیرت کی وہ جامع اور ہمہ جہت تصویر نہیں ابھرتی جو قرآن پیش کرتا ہے۔ کسی عظیم شخصیت کی سیرت کے مطالعہ کے لیے، اس ماحول اور حالات کا جاننا ضروری ہے جس میں وہ پیدا ہوئی، اس پر اثر انداز ہوئی اور اپنا انقلابی کردار انجام دیا۔

عہدِ رسالت

قرآن مجید نے مختلف مناسبتوں سے عہد رسالت کے مذہبی، سماجی اور تہذیبی حالات بیان کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بات یہ سامنے آتی ہے کہ اہل عرب وجودِ باری تعالیٰ کے منکر نہیں تھے۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس زمین و آسمان کا خالق اور حاکم ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝ (الزخرف:۹)

وہ تسلیم کرتے تھے کہ زمین جس پر وہ رہتے بستے ہیں اس کا سارا ساز و سامان اسی کا ہے۔ سات آسمان اور عرش عظیم کا وہی مالک ہے، ساری بادشاہت اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے پناہ دے، اسے پناہ حاصل ہوگی، اس کے مقابلہ میں کوئی پناہ دہندہ نہیں ہے۔ (المومنون: ۸۴-۸۹)

جب کشتی بھنور میں پھنس جاتی اور بچنے کی توقع نہ ہوتی تو اسی کو آواز دیتے اور

وعدہ کرتے کہ اس کے شکر گزار اور احسان شناس بن کر رہیں گے، لیکن بعد میں وہی سرکشی اور بغاوت کا رویہ اختیار کرتے جو پہلے سے تھا۔ (یونس: ۲۲، ۲۳)

اس عظیم کائنات پر اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرنے کے باوجود وہ مبتلائے شرک تھے اور معبودانِ باطل کی پرستش کرتے تھے:

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ ﴿١٠٦﴾ (یوسف:۱۰۶)

اس کی توجیہ وہ یہ کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ شرکا اس سے قربت کا ذریعہ ہیں۔[1]

سورۂ انعام، جو قرآن مجید کی موجودہ ترتیب میں پہلی مفصل سورت ہے، جسے مکی سورتوں کی تمہید بھی کہا جا سکتا ہے، اس کی آیات ۱۳۶-۱۴۰ میں اس کی کسی قدر تفصیل ملتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا اقرار کرنے کے باوجود اس کے خود ساختہ شریکوں سے خوف کھاتے تھے اور انھیں ہر حال میں خوش رکھنا چاہتے تھے۔ کھیتی اور مویشی، جو اللہ ہی کے عطا کردہ ہیں، اس میں اللہ تعالیٰ کا حصہ نکالتے، اس کے ساتھ اپنے خداوندانِ باطل کا بھی حصہ مقرر کرتے، لیکن اہمیت ان ہی خداوندوں کی ہوتی۔ یہ تو ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے حصہ میں سے کچھ ان کے حصہ میں چلا جاتا، لیکن یہ ناممکن تھا کہ ان خداؤں کا جو حصہ ہے اس کا تھوڑا بہت اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل ہو جائے۔

کبھی جانوروں اور کھیتی کے بارے میں کہتے کہ یہ ممنوع ہیں، ان کا استعمال صرف وہی کر سکتے ہیں جسے وہ چاہیں۔ غالباً یہ (پروہتوں اور پجاریوں کے لیے مخصوص تھا) کسی اونٹ کو سانڈ کی طرح دیوتاؤں کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس سے بار برداری کا کام نہیں لیا جاتا تھا۔ اونٹنی کے ذبح کرنے کے بعد اس کے پیٹ سے زندہ بچہ نکلتا تو اس سے صرف مرد لطف اندوز ہوتے۔ اگر وہ مردہ ہوتا تو عورتیں بھی اس میں شریک ہو سکتی تھیں۔ قتلِ اولاد

---

(۱) اس کی تفصیل راقم نے اپنے مضمون 'قرآن کی صداقت کے دلائل' اور بعض دوسرے مضامین میں پیش کی ہے۔ اس پر مزید علمی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: 'خدا اور رسول کا تصور-اسلامی تعلیمات میں'، بحث: 'خدا ایک ہے'۔

ایک سنگین جرم ہے۔اس کا بھی مختلف وجوہ سے ارتکاب ان کے ہاں ہو رہا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ عرب جاہلیت کا حال جاننا چاہو تو سورۂ انعام کی مذکورہ بالا آیات کا مطالعہ کرو۔ان آیات میں جن امور کا ذکر ہے قرآن مجید میں ان کا بار بار ذکر آیا ہے۔اور ان کی قباحتیں بیان ہوئی ہیں۔اس کی ایک مثال سورۂ مائدہ کی آیت ۱۰۳ ہے جن میں ان اونٹوں کا ذکر ہے جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیے جاتے تھے اور جن سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی ابتدائی زندگی

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے:

اَلَمۡ يَجِدۡكَ يَتِيۡمًا فَاٰوٰى ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰى ۝۸ (الضحیٰ:۶-۸)	کیا ہم نے تمھیں یتیم نہیں پایا اور ٹھکانا فراہم کیا، اور تمھیں حیران و سرگشتہ پایا اور راہ دکھائی اور تمھیں بے سروسامان اور غریب پایا اور بے نیاز کر دیا۔

اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔خاص بات یہ کہ اس میں آپ کے عہدِ طفلی، دورِ شباب اور بعثت کا ذکر ہے کہ ہر نازک مرحلہ میں اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت آپ کے شامل حال رہی اور آئندہ بھی رہے گی۔

رسالت سے قبل آپ کی زندگی اتنی صاف شفاف اور آپ کا کردار اتنا بلند تھا کہ مکہ کی آبادی آپ کو صادق و امین کہتی تھی اور کبھی کسی کو حرف گیری کا کوئی موقع نہیں ملا۔قرآن مجید نے اسے دلیلِ رسالت کے طور پر پیش کیا ہے:

قُلۡ لَّوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوۡتُهٗ عَلَيۡكُمۡ وَلَاۤ اَدۡرٰٮكُمۡ بِهٖ ۖ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝۱۶ (یونس:۱۶)	اگر اللہ چاہتا تو میں یہ قرآن تمھیں پڑھ کر سناتا اور نہ اس سے واقف کراتا۔ میں تمھارے درمیان اس سے پہلے ایک عمر گزار چکا ہوں۔کیا تم سوچتے نہیں ہو۔

جس شخص کی زبان کبھی جھوٹ سے آلودہ نہ ہوئی ہو، کیا وہ اللہ تعالیٰ پر افترا پردازی کرے گا؟ جس نے آج تک کسی کو دھوکا نہ دیا ہو، کیا اب وہ اللہ کا نام لے کر فریب دے گا؟ جس نے کبھی وحی و رسالت کا ذکر نہ کیا ہو، اس کی زبان پر یہ بلیغ کلام کیسے جاری ہو گیا؟ کیا تمھاری عقل اسے غلط کار اور فریبی کہہ سکتی ہے؟ اس سے بہت سے ان الزامات کی تردید ہوتی ہے جو آپ کی ذاتِ گرامی اور قرآن مجید پر کیے جاتے ہیں۔

خاندانی زندگی

رسول اکرم ﷺ کی عائلی زندگی سے متعلق قرآن مجید میں کافی تفصیل ملتی ہے۔ اس میں ازواجِ مطہرات سے آپ کی محبت، ہم دردی، ملاطفت اور مساوی سلوک کا بیان ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا ذکر ہے۔ انھیں اس کی پاس داری اور احترام کا حکم دیا گیا ہے:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝۳۴ (الاحزاب: ۳۴)

یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمھارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں۔ بے شک اللہ لطیف اور باخبر ہے۔

ازواج مطہرات کے آپس کے تعلقات، رقابت، ہر ایک کی یہ کوشش کہ رسول اللہ ﷺ کا زیادہ قرب اسے حاصل ہو۔ اس میں بعض اوقات بے احتیاطی یا نامناسب رویہ بھی سامنے آتا، اس پر تنبیہ اور اصلاح کی گئی۔ بتایا گیا کہ وہ امت کی مائیں ہیں۔ انھیں امت کے لیے نمونہ ہونا چاہیے۔ ان کی لغزش دوسروں کی غلطی اور کوتاہی کا سبب بن سکتی ہے۔ دنیا کی طلب ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔

ایک موقع پر ام المومنین حضرت عائشہؓ کی عفت و عصمت پر منافقین نے حملہ کر دیا۔ ان کی شان میں نازیبا باتیں کی جانے لگیں۔ اس سے بعض نیک طبع اور سادہ مزاج لوگ بھی متاثر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی برأت کا اعلان ہوا کہ اس طرح کا خیال بھی کسی مسلمان کے دل میں نہیں آنا چاہیے۔

متبنّٰی حقیقی اولاد نہیں ہے

متبنّٰی حقیقی اولاد نہیں ہے۔اس لیے اس پر حقیقی اولاد کے احکام نافذ نہیں ہو سکتے۔ حضرت زیدؓ، جو رسول اللہ ﷺ کے متبنّٰی تھے، انھوں نے حضرت زینبؓ کو طلاق دی تو ان سے آپ نے نکاح کیا اور ہمیشہ کے لیے ثابت ہو گیا کہ متبنّٰی کا حکم حقیقی اولاد کا نہیں ہے۔ ان کے باپ ہی کی طرف ان کی نسبت ہوگی۔البتہ ان سے دینی رشتہ باقی رہے گا۔اس ذیل میں یہ بات بھی آئی کہ آپ کے اولاد نرینہ نہیں ہے: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ (الاحزاب:۴۰)۔اس طرف اشارہ سورۂ کوثر میں بھی ہے۔

آغازِ وحی

وحی و رسالت کا آغاز اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱ سے ہوا۔ یہ حیات مبارکہ کا انقلابی واقعہ تھا۔اب آپ سماج کے لیے سب سے مہذب، شریف، صادق و امین انسان ہی نہیں تھے، بلکہ مبعوث من اللہ تھے، جسے دنیا کی ہدایت و راہ نمائی کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔اب آپ کی حیثیت پوری دنیا کے قائد و راہ نما کی تھی۔دنیا کے لیے توحید اور آخرت کا عقیدہ جتنا ناقابل قبول تھا اتنا ہی، بلکہ اس سے زیادہ آپ کا اعلان رسالت تھا۔آج بھی منکرین و مخالفین اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ آپ کی بعثت اللہ کی طرف سے ہوئی ہے اور عرب و عجم اور مشرق و مغرب کو آپ کی سیادت و قیادت تسلیم کرنی ہوگی۔اسی میں دنیا اور آخرت کی فلاح ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (الاعراف:۱۵۸)

کہہ دو اے لوگو! میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول ہوں جس کی آسمانوں اور زمین پر بادشاہت ہے۔

قرآن مجید نے آپ ﷺ کی اس حیثیت کو مختلف پہلوؤں سے واضح کیا ہے کہ آپ ﷺ

رسولِ برحق ہیں۔ اس میں کسی کو شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے اور قرآن آپ کی صداقت کی دلیل ہے:

یٰسٓ ۝١ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝٢ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٣ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝٤ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝٥ (یٰسٓ:١-٥)

یٰسٓ، قسم ہے قرآن کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو، سیدھے راستے پر ہو (اور یہ قرآن) غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے۔

قرآن مجید نے بار بار اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ آپ بشر تھے اور بشری خصوصیات اور تقاضے رکھتے تھے۔ آپ کا امتیاز یہ ہے کہ آپؐ پر اللہ تعالیٰ کی وحی نازل ہوتی ہے کہ وہی ایک معبودِ حقیقی ہے۔ جو اس پر ایمان لائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے اور اس کے احکام کی پابندی کرے وہ کام یاب ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝١١٠ (الکہف:١١٠)

اے نبی ﷺ! کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے۔

اس میں آپ کی بشریت کے ساتھ آپ کی رسالت اور پیغام کا ذکر ہے۔ آپ نے دنیا میں جو کارنامہ انجام دیا، وہ بہ حیثیتِ رسول تھا۔ اس پہلو سے آپ کی سیرت کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

آپؐ کی رسالت کی ایک دلیل آپؐ کا 'امی' ہونا ہے۔ آپ کو 'نبیِ امی' اس لیے کہا گیا کہ آپؐ نے رسمی تعلیم نہیں پائی تھی۔ آپؐ نوشت و خواند سے ناواقف تھے۔ اس کے باوجود آپ نے اس کائنات کی حقیقت، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، آخرت اور اس کے احوال، وحی و رسالت اور انسان کے آغاز و انجام سے دنیا کو آگاہ کیا اور اس کی بنیاد پر ایک نیا نظامِ فکر و عمل پیش کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا ذریعۂ علم انسانی ذرائع علم سے

اعلیٰ اور برتر ہے اور وہ وحی الٰہی ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ۝۴۸ (العنکبوت:۴۸)

آپ اس سے پہلے کسی کتاب کی تلاوت نہیں کرتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔اس صورت میں باطل پرست لوگ شک کر سکتے تھے۔

اس حقیقت کو اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۝۴ (النجم:۴-۳)

وہ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

ایک جگہ نزولِ قرآن کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝۱۹۲ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۝۱۹۳ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۝۱۹۴ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۝۱۹۵ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ۝۱۹۶ (الشعراء:۱۹۲-۱۹۶)

یہ ربّ العالمین کی نازل کردہ چیز ہے۔اِسے لے کر تیرے دل پر امانت دار رُوح اُتری ہے، تاکہ تو ان لوگوں میں شامل ہو جو (خلقِ خدا کو) متنبہ کرنے والے ہیں، یہ وحی صاف صاف عربی زبان میں ہے، اور اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی یہ موجود ہے۔

دعوت کا ذکر

رسول اللہ ﷺ کی منصبی ذمہ داریوں کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے۔یہ ذمہ داریاں مختلف نوعیت کی ہیں۔آپ کی تبلیغی ذمہ داریوں کے متعلق ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا۝۴۵ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۝۴۶ (الاحزاب:۴۵-۴۶)

اے نبیؐ! ہم نے آپ کو بھیجا ہے (حق کا) گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا، اللہ کی اجازت سے اُس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر۔

شہادتِ حق، بشارت اور انذار، دعوت الی اللہ آپ ﷺ کے سراج منیر ہونے

کے مختلف پہلو ہیں۔

منصبِ رسالت پر سرفراز ہونے کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دی تو آغاز میں معدودے چند افراد نے آپ کا ساتھ دیا۔ مجموعی طور پر قوم کا ردِ عمل سخت تھا۔ قرآن کو شاعری، سحر، داستاں گوئی کہا جاتا۔ اس پر طنز و تعریض اور استہزا کیا جاتا۔ قرآن مجید نے تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس صورت حال میں ان کی لاف زنی اور لایعنی بحثوں کو صبر سے برداشت کرنے کا حکم دیا گیا۔

مخالفین نے آپؐ پر اور آپؐ کے ساتھیوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے۔ طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ اسی کے ساتھ آپ کو دعوت و تبلیغ سے باز رکھنے کے لیے کبھی آپ سے دوسرا قرآن پیش کرنے کے لیے کہا جاتا۔ کبھی کہا جاتا کہ آپ اپنے موقف میں نرمی اختیار کریں تو ہمارا رویہ بھی تبدیل ہوسکتا ہے:

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝ (القلم:۹)

وہ چاہتے ہیں کہ اگر آپ مداہنت کریں تو وہ بھی مداہنت کریں۔

ان تمام سختیوں کے باوجود حکم ہوا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (الحجر:۹۴)

جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے واشگاف کہہ دو اور مشرکین سے منہ پھیرلو۔

آپ کو حکم ہوا کہ آپ واضح کر دیں کہ فکر و عمل کی ان کی راہ جدا ہے اور آپ کی جدا۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (یونس:۴۱)

اگر وہ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو کہہ دیجیے کہ میرا عمل میرے لیے ہے اور تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔

آپ کو اطمینان دلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت کامیابی بہر حال آپؐ ہی کے حصہ میں آئے گی:

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿٥١﴾ (مومن:۵۱)	بے شک ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی اور اس دن بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔

یہی بات ایک اور جگہ ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿٦٠﴾ (الروم:۶۰)	اے نبیؐ! صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور ہر گز ہلکانہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔

دوسری طرف مخالفین کے بارے میں کہا گیا:

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿٢٢٧﴾ (الشعراء:۲۲۷)	اور ظلم کرنے والوں کو عن قریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔

کہا گیا کہ مستقبل قریب میں ان کی ناکامی یقینی ہے:

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿٤٥﴾ (القمر:۴۵)	عن قریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے۔

ہجرت

اہل مکہ کے ساتھ کش مکش جب آخری حد کو پہنچ گئی اور مدینہ کے قبائل اوس و خزرج نے آپ کو پناہ دینے کا فیصلہ کیا تو مدینہ کی طرف صحابہ کرامؓ ہجرت کرنے لگے۔ مشرکین نے سوچا کہ یہ بھی کسی وقت مدینہ چلے جائیں گے۔لہٰذا اس سے پہلے ہمیں کوئی حتمی اقدام کرنا چاہیے۔قرآن اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿٣٠﴾ (الانفال:۳۰)	جب منکرینِ حق تمھارے خلاف تدبیریں کر رہے تھے کہ تمھیں قید کر دیں، یا قتل کر دیں یا یہاں سے نکال دیں۔ وہ اپنی چال چل رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا۔ اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

ایک اور جگہ مخالفین کے منصوبے کا ذکر ہے اور کہا گیا کہ وہ اس میں کام یاب نہیں

ہوں گے:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾ (بنی اسرائیل:۷۶-۷۷)

بے شک یہ اس کوشش میں ہیں کہ تم اس سرزمین پر نہ رہو اور وہ تمھیں اس سے نکال دیں۔ اس کے بعد وہ خود بھی زیادہ دن نہ رہ سکیں گے۔ ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے ہیں ان کے سلسلے میں ہماری یہی سنت رہی ہے اور تم ہماری اس سنت میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔

بہر حال ہجرت ہوئی اور آپؐ اپنے رفیقِ سفر حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ غارِ ثور میں روپوش رہے۔ ایک موقعہ پر دشمن غار کے دہانہ پر پہنچ گئے تو حضرت ابوبکرؓ کو تشویش ہوئی۔ اس حال میں آپ نے وہ تاریخی جملہ کہا، جو اللہ پر آپ کے اعتماد و توکل کا مظہرِ کامل ہے:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ (التوبۃ:۴۰)

غم نہ کرو! بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

آگے فرمایا:

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الْعُلْيَا (التوبۃ:۴۰)

اس نے کافروں کا بول نیچا کر دیا اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے۔

غزوات

رسول اللہ ﷺ کے غزوات کا قرآن مجید میں کہیں اختصار سے اور کہیں تفصیل سے بیان ہے۔ سورۂ انفال میں غزوۂ بدر کا ذکر کافی تفصیل سے آیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں جنگ احد پر تبصرہ ہے کہ کس طرح جیتی ہوئی جنگ شکست میں تبدیل ہوگئی۔ سورۂ احزاب میں جنگ احزاب کا تذکرہ ہے، اس میں مشرکین، یہود اور منافقین کا کردار زیرِ بحث آیا ہے۔ سورۂ حشر میں مدینہ کے یہود کے اخراج کا بیان ہے۔ سورۂ فتح میں صلح حدیبیہ کو 'فتح مبین' کہا گیا اور وہ فی الواقع فتح مبین ثابت ہوئی۔ سورۂ نصر میں فتح مکہ

کا ذکر ہے، جس کے بعد اسلام میں لوگ فوج در فوج داخل ہونے لگے اور حجاز پر اسلامی سلطنت قائم ہوگئی۔

اظہارِ دین

رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا ایک تاب ناک پہلو یہ ہے کہ منکرین اور مخالفین کی تمام تر کوششوں کے باوجود آپ کو سیاسی غلبہ حاصل ہوا اور جس دین کے آپ حامل تھے وہ پورے ملک کا دستور اور نظام حکم رانی بن گیا۔ آپ کی بعثت کا مقصد پورا ہوا:

هُوَالَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (الصّف:۹)	وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اسے پورے دین مخالف پر غالب کر دے، چاہے مشرکین اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔

یہ غلبہ دلیل و برہان کے میدان میں بھی ہوا اور سیاسی طور پر بھی۔ اس طرح اللہ کا وعدہ پورا ہوا کہ اہلِ ایمان کو وہ اقتدار عطا کرے گا۔

حالاتِ حاضرہ میں مکی عہدِ نبوی سے راہ نمائی

القلم دوحہ قطر ایک تعلیمی اور دعوتی ادارہ ہے۔ اس نے مؤرخہ ۳۰/جولائی تا ۲۸/اگست ۲۰۲۰ء آن لائن سیرت کانفرنس کا اہتمام کیا، جس میں ہر ہفتہ کسی صاحبِ علم کا خطاب ہوتا۔ اس عاجز کے لیے عنوان تجویز ہوا 'رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی اور موجودہ حالات'۔ میں نے اپنا خطاب ریکارڈ کرادیا اور وہ ۴/ستمبر ۲۰۲۰ء کو شب کے ۹ بجے نشر ہوا۔ اب اسی کو کسی قدر حذف و اضافہ کے بعد یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

حجاز کے مشہور شہر مکہ مکرمہ میں حضرت محمد ﷺ کی ولادت عام الفیل ۵۷۱ء میں ہوئی۔ ۱۰/اگست ۶۱۰ء کو آپ رسالت سے سرفراز ہوئے۔ مکہ ہی میں آپ فرائضِ رسالت انجام دیتے رہے۔ تیرہ سال بعد آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی۔ مدینہ میں دس سال قیام رہا اور اسلامی ریاست قائم کی، جو تا قیامت دنیا کے لیے مثالی ریاست رہے گی۔ ہجرت کے گیارھویں سال ۱۲/ربیع الاول کو آپؐ نے اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی۔

اس وقت آپؐ کے مکی دورِ رسالت کا مطالعہ پیش نظر ہے۔ موجودہ حالات میں ہمیں اس سے راہ نمائی حاصل کرنی ہے۔

بعثت سے قبل اہلِ عرب کا حال

۱۔رسول اکرم ﷺ خاتم الانبیا ہیں اور آپ کی بعثت ساری دنیا کے لیے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔آپ کے اولین مخاطب اہل عرب تھے،جن میں آپ کی ولادتِ باسعادت ہوئی۔اہل عرب منکرِ خدا نہ تھے۔وہ اسے خالق کائنات اور قادر مطلق سمجھتے تھے۔اس کے باوجود مبتلائے شرک تھے اور بہت سے خداؤں کی پرستش کرتے تھے۔اس بے عقلی میں وہ کوئی تضاد نہیں محسوس کرتے تھے:وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴿۱۰۶﴾ (یوسف:۱۰۶)''ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے تو ہیں،لیکن اس کے ساتھ وہ اس کے شریک بھی ٹھہراتے ہیں۔''

۲۔ان کا نسلی تعلق جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام سے تھا،اس کے باوجود وہ رسالت کے قائل نہ تھے۔وہ آپؐ کو صادق و امین تو مانتے تھے، لیکن آپ کی دعوت و رسالت کو اپنے لیے سخت مضرت رساں تصور کرتے تھے اور کسی قیمت پر اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

۳۔آخرت اور جزا و سزا کا تصور ان کے لیے نا قابل قبول تھا۔وہ اس بات کو بعید از امکان سمجھتے تھے کہ یہ دنیا ختم ہو جائے گی اور ایک دوسری دنیا وجود میں آئے گی اور انسان اپنے نیک اعمال کی جزا اور غلط روی کی سزا پائے گا۔

۴۔اہل عرب کے نزدیک اس دنیا کے آگے کسی اور دنیا کا تصور نہ تھا۔وہ یہاں کے عیش و عشرت ہی کو حاصلِ حیات سمجھتے تھے۔جو شخص اس سے جتنا فائدہ اٹھائے وہ ان کے نزدیک اتنا ہی ہوش منداور خوش قسمت تھا۔لہوولعب،زنا،بدکاری،قمار بازی اور شراب نوشی جیسی خرابیاں ان میں عام تھیں۔وہ ایک ہی سرزمین پر رہتے ہوئے مختلف قبائل میں منقسم تھے۔ان کے مابین معرکہ آرائی ہوتی رہتی۔قتل و غارت گری کا نہ رکنے والا سلسلہ جاری تھا۔ان کے درمیان زیردستوں کے حقوق محفوظ نہ تھے۔مشکل ہی سے مظلوموں کی دادرسی ہوتی۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوت

ان ناخوش گوار حالات میں رسول اللہ ﷺ نے توحید، رسالت اور آخرت کا عقیدہ پیش کیا کہ یہ دنیا اور آخرت کی فلاح کا وہ راستہ ہے جس کی راہ نمائی اس کائنات کے مالک نے کی ہے۔ اسی سے دنیا کا نظام بہتر ہوسکتا ہے، امن وامان اور عدل وانصاف کا قیام ممکن ہے اور انسانوں کے حقوق کی حفاظت ہوسکتی ہے۔ اسے قبول کرکے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوش نودی حاصل کرے گا اور آخرت میں بہترین اجر وثواب کا مستحق ہوگا، ورنہ روزِ محشر اسے اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ یہی معاملہ قوموں کے ساتھ پیش آئے گا۔ جو قوم اسے قبول کرے گی وہ آخرت میں فوز وفلاح سے ہم کنار اور دنیا میں سربلند ہوگی اور پستی سے نکل کر حکومت وفرماں روائی کے مقام تک پہنچے گی۔ جو قوم اسے رد کردے گی، دنیا کا خسران اس کا مقدر ہوگا اور عذابِ آخرت میں وہ گرفتار ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے اس دین کی تبلیغ ودعوت کا حکم تھا۔ کھل کر اور برملا اسے پیش کرنے کی تلقین وتاکید تھی۔ اس راہ کی مشکلات اور مصائب کو صبر وثبات اور پامردی کے ساتھ برداشت کرنے اور ہر حال میں اسے جاری رکھنے کی ہدایت تھی۔ آپؐ اس ہدایت پر عمل پیرا تھے۔ عقیدہ اور مذہب کی تبلیغ واشاعت اور اپنے افکار وخیالات کا اظہار انسان کا فطری حق ہے۔ آپؐ کے مخالفین اسے نہیں تسلیم کررہے تھے۔

مخاطبین کا ردعمل

رسول اللہ ﷺ دلائل سے اپنی دعوت پیش فرما رہے تھے۔ حکمت ودانائی اور وعظ ونصیحت کی راہ آپؐ نے اختیار کی تھی۔ آپؐ انتہائی اخلاص اور درد وسوز سے راہِ حق دکھا رہے تھے اور قوم کی فلاح وخیر خواہی میں خود کو گھلا رہے تھے۔ قرآن مجید کا بیان ہے:
لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٣﴾ (الشعراء:٣) ’’شاید تم اپنے آپ کو ہلاک کرلوگے، اگر وہ تمھاری بات نہ مانیں اور ایمان نہ لائیں۔‘‘ اس کے باوجود قوم کی طرف سے ضد، ہٹ دھرمی اور

مکابرت کا رویہ جاری تھا۔ وہ آپ کو دشمن اور بدخواہ کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتے تھے، لیکن جیتے جی آپ کی دعوت کو پھیلتے اور فروغ پاتے دیکھنا نہیں چاہ رہے تھے۔ انھوں نے آپؐ کو اس سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ دولت و ثروت کی، قوم کی قیادت اور سرداری کی اور اونچے سے اونچے خاندان سے ازدواجی رشتہ کی پیش کش کی۔ آپؐ نے اسے ٹھکرا دیا۔ فرمایا: ''تم جو متاعِ دنیا پیش کر رہے ہو اس کی میری نگاہ میں پرِ کاہ کی بھی حیثیت نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر اگر تم میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دو تو بھی میں اس دعوت سے باز نہیں آ سکتا۔ یہ کام یاب ہو کر رہے گی یا میری جان اسی راہ میں چلی جائے گی۔'' اس عزم کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

مخالفین ہی میں سے اہلِ ایمان پیدا ہو رہے تھے

رسول اکرم ﷺ کے مخالفین کے لیے سب سے زیادہ تشویش اور پریشانی اس بات سے لاحق تھی کہ خود ان کی صفوں سے، ان کے گھروں سے، ان کے بھائی بند، ان کے دست و بازو اور ان کے جگر گوشے آہستہ آہستہ اس دعوت کو سینے سے لگا رہے تھے۔ اس کے لیے وہ ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے، لیکن اس سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس طرح زمین ان کے چاروں طرف سے سمٹتی جا رہی تھی۔ پھر بھی وہ اس خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ ان کا اقتدار بہر حال باقی رہے گا:

اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾	کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے اطراف سے کم کرتے جا رہے ہیں۔ (پھر بھی) کیا وہ غالب ہی رہیں گے (الانبیاء: ۴۴)

جب کسی قوم کی شامت آتی ہے تو اسے اپنا مستقبل ہمیشہ محفوظ اور تاب ناک ہی نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کا اقتدار دائمی ہے، اس پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔ وہ نوشتۂ تقدیر نہیں دیکھ پاتی اور اپنے انجامِ بد کو پہنچ کر رہتی ہے۔

اہلِ ایمان کی تربیت

رسول اللہ ﷺ نے مکی دور میں حسبِ ذیل اقدامات کیے:

ایک یہ کہ جو سلیم الفطرت افراد آپ پر ایمان لائے، جنھوں نے آپ کی دعوت قبول کی اور آپ کی رفاقت کا عہد کیا، آپ نے ان کا 'تزکیہ' فرمایا۔ اللہ تعالیٰ سے ان کے تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر کیا۔ ان کے اندر تقویٰ اور طہارت کی آب یاری کی، خشوع وخضوع اور انابت کی کیفیت پیدا کی اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کے پاکیزہ جذبہ سے انھیں سرشار کیا۔ ان کی اس طرح دینی اور اخلاقی تربیت فرمائی کہ ان کا دامن جَور و بے داد، بدکاری، حق تلفی، شقاوت وسنگ دلی، کذب وافترا اور مکر وفریب جیسی ان خرابیوں سے پاک تھا جو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف اسی تربیت سے ان کے اندر صبر و تحمل، ایثار وقربانی، عفت وعصمت، راست بازی، حقوق کی پاسبانی، اخوت اور ہم دردی، محبت ورافت جیسی اعلیٰ صفات جلوہ گر ہوگئیں۔

صحابۂ کرام کی زندگی نمونہ تھی

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کی زندگی اس بات کا زندہ ثبوت فراہم کر رہی تھی کہ آپ کی دعوت کے نتیجہ میں کس طرح کے افراد تیار ہوتے ہیں اور کس قسم کا معاشرہ وجود میں آتا ہے؟ لیکن دشمنی اور عناد میں آپ کے مخالفین اس طرف سے آنکھیں بند کیے ہوئے ان پاک نفوس پر جور وستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے اور اپنی بالا دستی کے گھمنڈ میں سرشار تھے۔

غیر مسلموں کا تعاون

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اعلانِ رسالت اور تبلیغِ عام کے بعد آپ کی ہر طرف سے شدید مخالفت شروع ہوگئی اور اللہ کا دین اس کے بندوں تک

پہنچانے میں سخت دشواریاں پیش آنے لگیں۔ان نازک حالات میں آپ کے چچا جناب ابوطالب نے، جو دین آباء ہی پر قائم تھے، آپ کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا۔وہ بنو ہاشم کے سردار تھے، اس وجہ سے پورے قبیلے نے ان کا ساتھ دیا۔ان سب کی حمایت آپ کو حاصل رہی۔اس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی تھے۔رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد ابوطالب دس برس حیات رہے اور دم واپسیں تک ان کی حمایت جاری رہی۔سماج میں ان کے مرتبہ ومقام کی وجہ سے مخالفین آپ کے خلاف کوئی آخری قدم اٹھانہیں پا رہے تھے۔ حالات کی سنگینی اور سخت کش مکش کے باوجود رسول اللہ ﷺ دعوت وتبلیغ کا فرض مسلسل انجام دیتے رہے۔

ابوطالب کی وفات کے بعد اہل مکہ کی جانب سے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں زیادہ شدت آگئی۔مکہ میں آپ کا قیام مشکل ہوگیا۔آپ نے طائف کا سفر کیا اور وہاں کے سرداروں کو اللہ کے دین کی دعوت دی اور اس کام میں حمایت کی درخواست کی۔لیکن طائف کے سردار آپ کا مذاق اڑانے لگے اور آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے صاف منع کردیا۔آپ کے پیچھے وہاں کے اوباش لگ گئے اور سنگ باری شروع کردی، جس سے آپ کے قدم ہائے مبارک زخمی ہوگئے۔ یہ بڑی دردناک داستان ہے۔اب آپ کے لیے مکہ واپسی مشکل ہوگئی۔آپ نے بعض سردارانِ قبائل سے درخواست کی کہ وہ آپ کو تحفظ فراہم کریں۔انھوں نے معذرت کرلی۔ بالآخر مطعم بن عدی نے آپ کو پناہ دی اور آپ مکہ واپس تشریف لائے۔مکہ والوں کو اس پناہ کا احترام کرنا پڑا۔اس طرح کا حسنِ سلوک اس نے شعب ابی طالب میں بنو ہاشم کی محصوری میں بھی کیا تھا۔آپ نے اس کے اس سلوک کو یاد رکھا۔

قبائلِ عرب سے آپ کی درخواست

حج کے زمانہ میں مکہ سے باہر کے جو قبائل آتے آپ ان سے ملاقات کرتے اور

اللہ کا دین ان کے سامنے پیش کرتے اور اسے پھیلانے میں ان کی حمایت کی درخواست کرتے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ آپ کی اس درخواست کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

من یؤوینی، من ینصرنی حتی أُبلِّغَ رسالة ربی وله الجنة۔

(مسند احمد: ۹۷۱/۴۔حدیث نمبر ۱۴۲۴۳)

''کون ہے جو مجھے [اپنے ہاں] جگہ دے اور کون ہے جو میری مدد کرے تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں۔اس شخص کو جنت ملے گی۔''

اسی کوشش کے نتیجہ میں مدینہ کے قبائل اوس وخزرج سے آپ کا تعلق قائم ہوا اور آپ نے ہجرت فرمائی۔اس نے اسلام کی تاریخ کا رخ بدل دیا۔

مکہ کے نازک حالات میں حضرت ابوبکرؓ کو ابن الدغنہ نے پناہ دی۔حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا کہ انھیں گھر میں بھی باآوازِ بلند قرآن مجید پڑھنے کی اجازت نہیں ہے تو انھوں نے اسے رد کر دیا۔حضرت عمرؓ کو ان کے ماموں کی حمایت حاصل ہوئی اور حضرت عثمانؓ کو ولید بن مغیرہ نے پناہ دی۔یہ اصحاب اس پناہ سے جلد ہی نکل آئے۔اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اسے غلط سمجھتے تھے، بلکہ انھوں نے مناسب نہ جانا کہ عام مسلمان ہر طرح کی اذیتیں برداشت کر رہے ہوں اور وہ کسی غیر مسلم کی پناہ میں رہیں۔

مکی زندگی سے راہ نمائی

رسول اللہ ﷺ نے مکی دور میں جو طریقۂ کار اپنایا اس سے حسبِ ذیل رہ نمائی ملتی ہے:

۱۔امت مسلمہ اللہ تعالیٰ کے دین کی حامل ہے۔اس کی زندگی اس سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔اسے خیر امت کہا گیا ہے۔اس کی سیرت وکردار سے اس کا ثبوت ملنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید اور اپنے رسول ﷺ کی سنت کی حفاظت کا انتظام فرمادیا ہے۔وہ تاقیامت محفوظ رہیں گی۔جو شخص بھی اسلام کی حقیقی تعلیمات سے واقف ہونا چاہے وہ ان کی طرف رجوع کرسکتا ہے۔امت مسلمہ کو اس کا عملی نمونہ ہونا

چاہیے،لیکن افسوس کہ اس کے عمل سے اس کا ثبوت نہیں مل رہا ہے، بلکہ بسا اوقات وہ اس کی غلط تصویر پیش کرتی ہے۔ اس سے یہ خیال بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کا دین موجودہ حالات میں ناقابلِ عمل ہے، اس کے ماننے والے بھی اس پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ یہ تبلیغ دین کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، اسے دور ہونا چاہیے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ امت کی تجدید واصلاح کی بڑی قابل قدر کوششیں ہوتی رہی ہیں اور اب بھی ہورہی ہیں۔ ان کا سلسلہ منقطع نہیں ہونا چاہیے، تاکہ اسلام کا بہتر نمونہ سامنے آسکے۔ اس سے اللہ کے دین کو سمجھنا آسان ہوگا اور دنیا اس کی طرف توجہ کرسکے گی۔

۲۔ رسول اکرم ﷺ نے تبلیغ دین کا جو فرض انجام دیا اسے جاری رکھنا امت کی ذمہ داری ہے۔ اس سے کسی حال میں غفلت نہیں برتی جاسکتی، بلکہ اسی سے امت میں دین کی حقیقی روح بھی بیدار ہوگی اور اسی سے اس کی فلاح وترقی کی راہیں بھی کھلیں گی۔ موجودہ دور میں اسلام کے بارے میں شدید غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، بلکہ غلط فہمیاں پیدا کرنے اور انھیں پھیلانے کی مسلسل کوشش ہورہی ہے۔ اس کے نظامِ فکر وعمل کو باطل، فرسودہ اور انسانی سماج کے لیے ضرر رساں قرار دیا جاتا ہے۔ امت کی ذمہ داری ہے کہ ان غلط فہمیوں کو رفع کرے اور اسلام کی تعلیمات کو بے کم وکاست پیش کرے۔ یہ خدمت اسی حکمت و دانائی، نصح وخیر خواہی، دردوسوز اور اخلاص ومحبت سے انجام دی جانی چاہیے جس کا اسوۂ حسنہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں ملتا ہے۔ اس کے لیے صبر وثبات کے ساتھ مشکلات اور آزمائشوں کی وہ منزلیں بھی طے کرنی ہوں گی جن سے آپؐ کو گزرنا پڑا۔ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ جب تک آپ کا خطاب عقل ودانش کو اپیل نہ کرے اور آپ کے خلوص اور خیر خواہی پر یقین نہ ہو، مخاطب کی توجہ اس کی طرف نہ ہوگی اور اس کے رویہ میں کسی تبدیلی کا امکان تو مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

آئینی حقوق کے علم برداروں سے تعاون حاصل کیا جائے

جمہوری ممالک میں ہر شخص کو دستوری طور پر بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ان میں مذہبی آزادی کا حق بھی ہے۔ان ممالک میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے نسبتاً زیادہ مواقع پائے جاتے ہیں۔ان مواقع کا استعمال ایک دینی تقاضا ہے۔اس میں کوتاہی پر اللہ تعالیٰ کے ہاں باز پرس ہوسکتی ہے۔جمہوری ملکوں میں بھی کبھی کبھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ردعمل دیکھا جاتا ہے۔تبلیغ اسلام کی پرامن مساعی کو بھی ملک کے مفاد کے منافی سمجھا جاتا ہے۔اسے صبر وتحمل سے برداشت کرنا ہوگا۔اس کے جواب میں غیر دستوری ردعمل کو کسی طرح درست نہیں قرار دیا جاسکتا۔اس کا مقابلہ ملکی قانون ہی کے ذریعہ سے کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ان ممالک میں جو افراد اور تنظیمیں دعوت دین کا فرض انجام دے رہی ہیں ان کے درمیان تعاون اور اشتراکِ عمل ہونا چاہیے۔ اس میں وطن، زبان اور مسلک جیسی چیزوں کو حائل نہیں ہونا چاہیے۔ان میں وہ اخوت ہونی چاہیے جو رسول اللہ ﷺ نے اہلِ ایمان کے درمیان قائم کی تھی۔

ہمارے ملک کی صورتِ حال

اب ہم اپنے ملک کے بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں۔ہمارا ملک ایک جمہوری ملک ہے۔اس میں ازروئے دستور ہر شخص کو اظہارِ خیال کی آزادی حاصل ہے۔تمام باشندگانِ ملک کو بغیر کسی فرق وامتیاز کے بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔لیکن عملاً اس کی خلاف ورزی بھی ہوتی رہتی ہے۔اقلیتوں کے اور خاص طور پر مسلمانوں کے حقوق بری طرح متاثر ہیں، جسے کسی بھی طرح جائز نہیں قرار دیا جاسکتا اور یہ ملک کے لیے بھی سراسر نقصان دہ ہے۔

خوشی اس بات کی ہے کہ ہمارے اسی ملک میں ایسے افراد اور تنظیمیں بھی ہیں جو آزادیِ فکر وعمل کو انسان کا بنیادی حق تسلیم کرتی ہیں اور اس بات کی قائل ہیں کہ مسلمانوں کو

بھی یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے عقیدے اور مذہب پر عمل اور اس کی تبلیغ و اشاعت کر سکیں۔ اس طرح کے افراد اور جماعتوں سے ہمارے روابط بڑھنے چاہییں اور تبلیغ دین کا جو فطری حق ہے اس کا استعمال جاری رہنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کے اسوے سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کے مخصوص حالات کے پیش نظر مسلمانوں کی جان، مال اور عزت و آبرو کے تحفظ، پرسنل لا کی حفاظت اور سیاسی تقاضوں کے تحت امت کے ذمہ داروں کے غیر مسلموں سے روابط ہیں، لیکن اسلام کی صحیح تعلیمات پیش کرنے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش نہیں ہو رہی ہے، بلکہ یہ پہلو نظر انداز ہو رہا ہے۔ اگر تبلیغ و دعوت کے میدان میں غیر مسلموں کا تعاون حاصل ہو اور وہ اسے امت کا ایک جائز حق سمجھنے لگیں تو اسلام کی اشاعت کے زیادہ مواقع حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ اس راہ کی بہت بڑی کام یابی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ سے بصد عجز و نیاز دعا ہے کہ وہ ان گزارشات پر غور کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق سے بہرہ ور فرمائے۔

علماءِ امّت۔ وارثین انبیاء

مئی ۲۰۱۸ء کے پہلے ہفتے میں مولانا سید جلال الدین عمری امیر جماعت اسلامی ہند نے جناب نصرت علی صاحب نائب امیر جماعت اسلامی ہند کے ساتھ کیرلا کی راجدھانی تریوندرم کا سفر کیا۔ ۷رمئی کو علماء کانفرنس تھی۔ اس میں شرکت کرنے والے، مختلف مکاتب فکر کے علماء کی تعداد کئی سو تھی۔ اس میں مولانا نے جو مضمون پڑھا تھا اسے یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ کچھ باتوں کی وضاحت زبانی بھی کی گئی تھی۔ آخر میں سوالات کے جوابات دیے گئے تھے۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو جنت سے اتار کر زمین پر بھیجا تو کہا کہ اللہ تعالیٰ تمھیں بھٹکنے نہیں دے گا، بلکہ تمھاری اور تمھاری نسل کی ہدایت کا بھی انتظام کرے گا۔ اس کے مطابق تمھاری حیات ارضی ہوگی تو تم سرخ رو اور کام یاب ہوگے اور جنت کا راستہ تمھارے لیے کھلا رہے گا، ورنہ تمھارا انجام برا ہوگا اور جہنم تمھارا ٹھکانا ہوگا:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

ہم نے کہا: تم سب یہاں سے (زمین) پر اتر جاؤ۔ اگر تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، انھیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝۳۹ (البقرۃ:۳۸-۳۹)

اور جو اس کا انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ دوزخ میں جائیں گے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

یہ سورۂ بقرہ کی آیات ہیں۔سورۂ طٰہٰ میں یہی بات کسی قدر تفصیل سے بیان ہوئی ہے:

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًۢا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى۝۱۲۳ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۝۱۲۴ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا۝۱۲۵ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى۝۱۲۶ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى۝۱۲۷ (طٰہٰ:۱۲۳-۱۲۷)

اس نے کہا:تم دونوں ایک ساتھ زمین پر اتر جاؤ۔تم اور شیطان ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔اگر میری طرف سے تمھارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا۔ اور جو میرے ذکر سے منھ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں ضیق کی زندگی ہوگی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔وہ کہے گا: پروردگار! دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا، یہاں مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اسی طرح ہماری آیات تیرے پاس آئی تھیں، تو نے انھیں بھلا دیا تھا۔اس طرح آج تجھے فراموش کیا جارہا ہے۔ اس طرح ہم بدلہ دیں گے حد سے گزرنے والوں اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لانے والوں کو اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے۔

انبیاء کے جانشینوں نے دعوتِ حق کا فرض انجام دیا

آدم وحوا کی اولاد پوری نسلِ انسانی ہے۔اس کے لیے تا قیامت یہ ایک کلّی اور ناقابلِ تغیر قانون تھا۔اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت وراہ نمائی کے لیے ہر دور میں اپنے رسول بھیجے، کتابیں نازل کیں اور انسانوں کو دنیا وآخرت کے انجام سے آگاہ کیا۔اللہ تعالیٰ کے

رسولوں نے اس کے لیے عقلی، فطری، تاریخی ہر طرح کے دلائل دیے۔ ان کے مخاطب ان کی تردید نہ کر سکے، اس طرح انھیں اپنے مخاطبین پر علمی برتری حاصل رہی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم شرک، ستارہ پرستی اور بت پرستی میں مبتلا تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کی کم زوری واضح کی اور توحید کا صاف ستھرا اور بے آمیز عقیدہ دلائل کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ آپ کے مخاطب اس میدان میں اپنی شکست تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ قرآن مجید نے حضرت ابراہیمؑ کی اس علمی برتری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ (الانعام:۸۳)

یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلے میں عطا کی۔ ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ تمھارا رب نہایت دانا اور علیم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو علم و حکمت کے بلند درجات عطا کیے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ علم اور دینی بصیرت ہی سے آدمی کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ اس سے علماءِ دین کے برتر مقام کا ثبوت ملتا ہے۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسولوں نے دعوتِ حق کا جو فرض انجام دیا وہی فرض ان کے صالح جانشینوں نے بھی ادا کیا۔ سورۂ سجدہ میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو کتاب (تورات) عطا کی۔ اس میں بنی اسرائیل کے لیے ہدایت کا سامان تھا۔ اس کے بعد فرمایا:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۣ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝ (السجدہ:۲۴)

اور ہم نے ان میں ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے راہ نمائی کرتے تھے جب انھوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں جو امام اور راہ نما پیدا کیے ان کے بارے میں کہا گیا کہ وہ انسانوں کی راہ نمائی کا فرض ہماری ہدایت کے تحت انجام دیتے تھے اور ہمارے

احکام کے پابند تھے۔ ان کے دو اوصاف بیان ہوئے ہیں: ایک یہ کہ ان کے اندر صبر و ثبات تھا۔ مشکلات کے باوجود انھوں نے استقامت کا ثبوت دیا اور اپنے موقف پر جمے رہے۔ ان کا دوسرا وصف ایمان تھا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اور اس کی ہدایت و راہ نمائی پر انھیں کامل یقین تھا۔ ان اوصاف کی وجہ سے وہ پیغمبروں کا فرض ادا کر پائے۔

بنی اسرائیل میں فساد اور بگاڑ کے باوجود ان کے اندر ایک حق پرست گروہ بھی رہا ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا:

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ﴿۱۵۹﴾ (الاعراف:۱۵۹)	قوم موسیٰ میں ایک ایسا گروہ بھی تھا جو حق کے مطابق لوگوں کی راہ نمائی کرتا اور حق ہی کے مطابق فیصلہ کرتا۔

اس بگڑی ہوئی قوم میں حاملینِ دین بھی تھے، جو حق و انصاف کے علم بردار تھے۔ وہ راہ حق واضح کرتے اور جب فیصلہ کرتے تو حق کے مطابق فیصلہ کرتے۔

یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ اللہ کے رسول حق و صداقت کے اظہار و اعلان کا جو فرض انجام دیتے ہیں ان کے سچے جانشین بھی وہی فرض انجام دیتے ہیں اور ان کے اندر وہ اعلیٰ اوصاف ہوتے ہیں جو قوموں کی راہ نمائی کے لیے لازمی ہیں۔

علماء انبیاء کے جانشین ہیں

اس امت کے علماء بھی پیغمبروں کے جانشین ہیں۔ انھیں بھی دنیا کی امامت و قیادت کا یہی فرض انجام دینا ہے۔

مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی میں حضرت ابو درداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إن العلماء ورثة الأنبياء و إن الأنبياء لم يورثوا ديناراً و لا درهماً وإنما ورثوا العلم، فمن أخذه أخذ بحظٍّ وافرٍ(مشکوٰۃ، کتاب العلم، عن أبی درداء)	بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء دینار و درہم کی وراثت نہیں چھوڑتے وہ تو علم کی وراثت چھوڑتے ہیں۔ جس نے اسے حاصل کیا اس نے بڑا حصہ پالیا۔

علمائے امت علمِ نبوت اور فکرِ نبوت کے وارث ہوتے ہیں۔ یہی ان کا امتیاز ہے۔اس علم کے ذریعہ وہ حق و باطل اور درست و نادرست کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ یہی علم انھیں حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت کے لیے صف آرا کرتا اور ان کے اندر اس راہ کی مشکلات کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔یہی وہ علم ہے جو دنیا کے درہم و دینار سے زیادہ گراں بہا ہے۔

تبیینِ کتاب علماء کی ذمے داری

رسول اللہ ﷺ کی ایک منصبی ذمہ داری تبیینِ کتاب اللہ رہی ہے، یعنی اللہ کے نازل کردہ دین کی توضیح وتشریح کرنا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۝۴۴ (النحل: ۴۴)

اور ہم نے یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تا کہ تم لوگوں کے سامنے اس ہدایت کی تشریح وتوضیح کرو جو ان کے لیے اتاری گئی ہے اور تا کہ لوگ (خود بھی) غور وفکر کریں۔

تبیینِ کتاب اللہ کے وسیع تقاضے ہیں۔اس میں الحاد اور شرک کی تردید، توحید، رسالت اور آخرت کا اثبات بھی ہے اور یہ بھی کہ ان کی حقانیت دلائل سے ثابت کی جائے۔ احکامِ شریعت کی معنویت واضح کی جائے۔اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو تسلیم کرنے کے خوش گوار عواقب اور اس کے انکار کے نتائج بد سے آگاہ کیا جائے۔ یہ عمل اس طرح انجام پائے کہ مخاطب سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ اسلام کے سلسلے میں اسے کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

تبیینِ کتاب کی یہی خدمت علماء کرام کو اس طرح ادا کرنی ہوگی کہ دنیا کے سامنے اسلام روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے اور وہ اس کے متعلق سوچنے اور اپنا رویہ متعین کرنے کے موقف میں ہو جائے۔یہی بات 'وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ' (شاید وہ اس پر غور کریں) میں کہی گئی ہے۔اس کے لیے موجودہ دور کے فکری رجحانات اور اسلام کے بارے میں اس کے رویے سے واقفیت ضروری ہے۔اس وقت اسلام کے اساسات ہی تنقید کی زد میں نہیں

ہیں، بلکہ اس کی بہت سی تعلیمات پر حملے ہو رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام جہادی مذہب ہے، وہ دہشت گردی اور خوں ریزی پر آمادہ کرتا ہے، اس کے ہاں انسان کے حقوق کا احترام نہیں پایا جاتا اور عورت اور مرد کے درمیان مساوات نہیں ہے۔ جہاں تک اس کے حدود و تعزیرات کا تعلق ہے انھیں سخت تنقید کا ہدف بنایا جارہا ہے ۔ اس طرح اسلامی تعلیمات پر ہر رخ سے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ اس سے آگے پورا دین ہی زیرِ بحث ہے۔ اس کے جواب میں اسلام کے عادلانہ اور مبنی بر انصاف موقف کی وضاحت آج کے علماء کی ذمہ داری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے مخالفین کہتے تھے: ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ (یونس:۱۵) ”اس قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن پیش کرو یا اس میں تبدیلی کرو۔“ چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا آج بھی مخالفین کا ذہن یہی ہے کہ قرآن کا فکر و فلسفہ نا قابل قبول ہے۔ کوئی دوسرا تصورِ حیات سامنے آئے یا اس میں اس طرح تبدیلی کردی جائے کہ وہ دورِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو تو اس پر گفتگو ہو سکتی ہے۔

جدید افکار سے واقفیت ضروری ہے

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ علم تقسیم ہو گیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو دین کی مطلوبہ واقفیت نہیں ہے۔ وہ اسلام کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف دینی مدارس کے فارغین ہیں، جو جدید افکار اور رجحانات سے پوری طرح باخبر نہیں ہیں۔ موجودہ دور کے سوالات کا جواب دینا ان کے لیے آسان نہیں ہے۔ حالاں کہ اسلام کی تاریخ میں دینی اور دنیاوی علوم کی اس طرح تفریق نہیں رہی۔ ہمارے ائمۂ دین وقت کے افکار اور فلسفے، علم کلام اور منطق سے پوری طرح واقف تھے اور اسلام کی روشنی میں اس کا جواب دے سکتے تھے۔ غزالی، ابن تیمیہ، ابن رشد، رازی اور متاخرین میں شاہ ولی اللہ اس کی مثال ہیں۔ انھوں نے اس وقت کے یونانی فکر و فلسفہ کی خامیاں واضح کیں، اس نے اسلامی عقائد سے متعلق جو سوالات کھڑے کیے تھے ان کا ان ہی کی زبان میں جواب دیا۔

اس طرح ایک نیا علم کلام وجود میں آیا۔

اس میں شک نہیں، دورحاضر میں ایسے اصحابِ علم ہیں جن کی جدید فکر و فلسفہ پر بھی نظر ہے اور جو اس کے اٹھائے ہوئے سوالات کا جواب بھی دے رہے ہیں۔ ان سب سے بغیر کسی تعصب اور تحزّب کے استفادے کی کوشش ہونی چاہیے۔ جماعت اسلامی نے دورِجدید کے موضوعات پر قابل قدر لٹریچر فراہم کیا ہے۔ اس میں موجودہ فکر و فلسفہ کی خامیاں بھی واضح کی گئی ہیں اور ان کے مقابلے میں اسلام کا نقطۂ نظر دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ درخواست ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ ہماری ایک دینی ضرورت ہے۔

جماعت کا زیادہ تر لٹریچر اردو زبان میں ہے، لیکن ہندی اور انگریزی میں اس کا اچھا خاصا حصہ منتقل ہو چکا ہے۔ جماعتی حلقوں نے علاقائی زبانوں میں ترجمہ اور تصنیف و تالیف کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس معاملے میں ملیالم زبان کافی آگے ہے۔ اس میں کیرلا کی جماعت نے وسیع پیمانہ پر اسلامی لٹریچر پیش کیا ہے۔ اس سے آپ حضرات شاید آسانی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

خوشی اس بات کی ہے کہ جماعت اسلامی ہند (کیرلا) کی دعوت پر علماء کرام اتنی بڑی تعداد میں اس اجلاس میں شریک ہیں۔ اس میں حنفی، شافعی، سلفی ہر مسلک کے علماء ہیں اور ملک کے مختلف اداروں سے انھوں نے سند حاصل کی ہے۔ یہ سب مل کر ایک متحدہ فورم کی تشکیل پر آمادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کوششوں کو قبول فرمائے اور ہم سب ایک ہو کر اللہ کے دین کے فروغ اور سربلندی کے لیے سرگرم ہو جائیں۔

داعیانِ دین کا کردار

اللہ کا دین پوری نوع انسانی اور اس کے ہر فرد کے لیے ہے۔ وہ 'یَا اَیُّھَا النَّاسُ' اور 'یَا اَیُّھَا الْاِنْسَانُ' کے الفاظ سے خطاب کرتا ہے۔ اس کے پیش نظر روئے زمین پر بسنے والا ایک ایک شخص ہوتا ہے۔ آدمی دنیا میں آتا ہے اور اپنی مہلتِ حیات پوری کر کے یہاں سے چلا جاتا ہے۔ اسی سلسلۂ موت وحیات میں اس کا امتحان ہے۔ کام یابی کا انحصار اس کے حسنِ عمل پر ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۝ (الملک:۲)	اللہ نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں کون اپنے عمل میں زیادہ اچھا ہے اور وہ غلبہ والا اور بڑا معاف کرنے والا ہے۔

دنیا میں ہر شخص امتحان کی حالت میں ہے

یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ اس کارگاہِ حیات میں امتحان ہے انسان کے حسنِ عمل کا۔ عمل میں حسن، شریعت کی پابندی اور اخلاص سے پیدا ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی فقدان، عمل کے حسن کو داغ دار کر دیتا ہے اور وہ اللہ کے دربار میں ناقابلِ قبول قرار پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت دیکھے گا کہ کون حسنِ عمل کا سرمایہ لے کر حاضر ہوا ہے اور کس کا دامن اس دولت سے خالی ہے اور وہ غلط روی اور بدعملی کا بوجھ اپنے کندھوں پر

لادے ہوئے پہنچا ہے۔ ہر ایک کا انجام اس کے سامنے ہوگا۔

فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ؕ۝۷ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸ (الزلزال:۷-۸)

جس نے ذرہ برابر خیر کا عمل کیا ہوگا اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی اسے بھی دیکھ لے گا۔

انسان کی کم زوری یہ ہے کہ وہ بسااوقات بھول جاتا ہے کہ یہ صورت حال دوسروں کی طرح خود اس کے ساتھ بھی پیش آنے والی ہے۔ قیامت میں اعمال کا وزن کرنے والی میزان کھڑی کی جائے گی اور دیکھا جائے گا کہ اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے یا بدی کا؟ اس کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔

فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِىۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ۝۷ وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا هِيَهۡ ؕ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱ (القارعۃ:۶ تا ۱۱)

پس جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ پسندیدہ زندگی میں ہوگا اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا، تم کو کیا خبر کہ وہ کیا ہے؟ دہکتی ہوئی آگ ہے۔

اس وقت ساری دنیا فکر وعمل کے فساد میں مبتلا ہے۔ خدا بے زاری اور اس کی معصیت نے پورے نظامِ حیات کو غلط رخ پر ڈال رکھا ہے، انسان کے قدم تیزی سے دنیا اور آخرت کی تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اللہ کا دین انسانوں کو اس تباہی سے بچاتا ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ انسان اپنی مفسدانہ روش بدلے اور صالح اقدارِ حیات کا پابند ہو۔ اللہ تعالیٰ کی زمین کو فتنہ وفساد سے پاک ہونا چاہیے۔ اس کے لیے اس سے امید ورجا کے تعلق کا پایا جانا ضروری ہے۔ اسی سے وہ اس کی رحمت کا مستحق ہوگا:

وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا وَادۡعُوۡهُ خَوۡفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝۵۶ (الاعراف:۵۶)

زمین میں فساد نہ مچاؤ اس کی اصلاح کے بعد اور اسے پکارو خوف وطمع سے۔ بے شک اللہ کی رحمت محسنین سے قریب ہے۔

موجودہ دور میں جو فساد فی الارض پایا جاتا ہے اور جس کے ثمراتِ بد سے کوئی بھی

محفوظ نہیں ہے، اسے صحیح سمت دینے کی لازماً فکر ہونی چاہیے۔ یہ دین وایمان کا تقاضا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا کے فساد و بگاڑ پر ہمارے درمیان گفتگو ہوتی رہتی ہے۔اس کے لیے جو کچھ ہم کر سکتے ہیں، وہ کرتے بھی ہیں۔

دعوت اور کردار میں مطابقت ضروری ہے

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس دین کو ہم ساری دنیا کے لیے راہِ نجات سمجھتے ہیں، مسائل کے حل کے لیے خدا ترسی اور آخرت کی باز پرس کو لازم قرار دیتے ہیں۔ ہمیں اپنے قول و عمل سے اور پوری زندگی سے اس کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا۔ اللہ کے رسول ﷺ سب سے بڑے داعی الی اللہ تھے۔ آپ سے کہا گیا:

قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ﴿۱۱﴾ وَ اُمِرۡتُ لِاَنۡ اَکُوۡنَ اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۲﴾ قُلۡ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۳﴾ (الزمر: ۱۱ تا ۱۳)

کہو، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت کروں دین کو اس کے لیے خالص کر کے اور مجھے حکم ہے کہ میں سب سے پہلے فرماں بردار بن جاؤں۔ کہو، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

یہی بات سورۃ الانعام: ۱۴-۱۵ میں کہی گئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس فرمانِ خداوندی کا اعلان کیا تو کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ اس کی تردید کر سکیں۔ اس لیے کہ آپ کی سیرت اور روشِ حیات قدم قدم پر اس کا ثبوت پیش کر رہی تھی۔

دنیا ہماری دعوت کے ساتھ ہمارے عمل کو دیکھ رہی ہے۔ افسوس کہ ہمارا عمل ہمارے دعوے کا کماحقہ ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ ہم اس موقف میں نہیں ہیں کہ کہہ سکیں ہماری پاکیزہ دعوت اور ہمارا کردار ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ ان میں کوئی دوری اور فاصلہ نہیں ہے۔ ہم شب و روز دنیا کے حالات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ہمارے درمیان

اس پر مستقل گفتگو ہوتی رہتی ہے، کیا ہم شب کے سکوت میں، دن کے مشاغل میں، اپنے گوشۂ تنہائی اور اپنی مجلسوں میں اپنے کردار اور عمل کا اس طرح جائزہ بھی لیتے ہیں کہ ہماری یہ ناپائے دار زندگی اللہ کی ہدایات کی کس حد تک تابع ہے؟ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ موضوع ہمارے لیے غور طلب ہی نہیں ہے، پھر 'حسن عمل' کی راہیں کیسے کھلیں گی؟

حضرت شعیبؑ اپنی قوم اہلِ مدین سے کہتے ہیں:

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ (ہود:۸۸)

میں نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تمھیں منع کرتا ہوں اس کے خلاف کروں (اس کا ارتکاب کرنے لگوں) میں اپنی استطاعت کی حد تک اصلاح چاہتا ہوں۔ مجھے توفیق اللہ ہی سے مل سکتی ہے۔ میرا اسی پر بھروسہ ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

داعی کو اسی بلند کردار کے ساتھ اپنے مخاطبین کے درمیان کھڑا ہونا چاہیے کہ وہ اس کی دعوت اور کردار میں کسی قسم کا تضاد نہ محسوس کریں۔

کام یاب اہلِ ایمان کے اوصاف

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اہل ایمان کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ہم ان کو ایک عمومی بیان سمجھتے ہیں۔ان کا مطالعہ اس طرح کرتے ہیں جیسے ہم براہ راست اس کے مخاطب نہیں ہیں۔حالاں کہ ان کا تعلق فرد اور جماعت دونوں سے ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں ہم اپنی اور جماعت کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کی جارہی ہے۔سورۃ المؤمنون کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (بے شک ایمان والے فلاح پا گئے)

اس کے بعد ان کی چھ صفات بیان ہوئی ہیں:۱۔خشوع کے ساتھ نماز، ۲۔لغویات سے اعراض، ۳۔زکوٰۃ پر عمل۔(اللہ کی راہ میں انفاق) ۴۔جنسی خواہش کی صرف جائز

حدود میں تکمیل، ۵۔امانت اور عہد و پیمان کی نگہ داشت، ۶۔نمازوں کی ان کی حدود وشرائط کے ساتھ پابندی۔آخر میں کہا گیا ہے کہ ان اوصاف کے حامل جنت الفردوس کے وارث ہوں گے۔ان اوصاف کا تعلق تمام اہل ایمان سے ہے۔فرد سے بھی جماعت سے بھی۔کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔بات کا آغاز اس سے ہوتا ہے: قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ۔دنیا اہلِ ایمان کو ناکام سمجھتی ہے۔حالاں کہ کام یابی اور ناکامی کا تعلق خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بلندیِ کردار سے ہے۔یہ اوصاف جن میں پائے جائیں ان کی فلاح و کام رانی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

کام یاب اہل ایمان کا پہلا وصف یہ ہے کہ وہ نماز کے پابند ہی نہیں ہوتے، بلکہ ان کی نمازوں میں خشوع پایا جاتا ہے۔خشوع کے معنی ہیں جھک جانا اور پست ہوجانا۔قیامت میں کسی کو زبان کھولنے اور دم مارنے کی ہمت نہ ہوگی۔اسے خشوع سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَخَشَعَتِ الۡاَصۡوَاتُ لِلرَّحۡمٰنِ فَلَا تَسۡمَعُ اِلَّا هَمۡسًا ﴿۱۰۸﴾ (طٰهٰ:۱۰۸)

تمام آوازیں رحمان کے خوف سے دب جائیں گی اور تم نہیں سنو گے مگر پیروں کی آہٹ۔

ایک جگہ اہلِ ایمان سے خطاب ہے:

اَلَمۡ يَاۡنِ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِكۡرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَـقِّ ۙ (الحدید:۱۶)

کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور جو حق نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں۔

اہلِ ایمان کی صفت 'الخاشعین والخاشعات' (الاحزاب:۳۵) بیان ہوئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے نماز تہجد کی کیفیت حضرت علیؓ نے ایک حدیث میں تفصیل سے بیان کی ہے۔فرماتے ہیں جب رکوع میں جاتے تو زبان مبارک پر یہ کلمات ہوتے:

اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَلَكَ اَسْلَمْتُ خَشَعَ لَكَ سَمْعِيْ وَبَصَرِيْ وَمُخِّيْ وَعَظْمِيْ وَعَصَبِي۔ (مسلم: مسافرین حدیث ۲۰۱، ابوداؤد: صلوٰۃ ۱۹۰، ترمذی: دعوات ۲، ۳)	اے اللہ! میں نے تیرے لیے رکوع کیا۔(اپنی پشت خم کردی) تجھ پر ایمان لایا، تیرے سامنے سر جھکایا۔ میرے کان، میری آنکھیں، میری ہڈیاں، ہڈیوں کا گودا، میرے اعصاب سب تیرے سامنے جھک گئے۔

کیا اس طرح کی نماز ہم نے کبھی پڑھی ہے؟

سورۂ توبہ میں ان خوش قسمت انسانوں کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ نے جن کے جان اور مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔ اس بیع پر انھیں فوزِ عظیم کی بشارت دی گئی ہے کہ اس سے کام یاب بیع کوئی نہیں ہوسکتی۔ پھر ان کے اوصاف بیان ہوئے ہیں کہ وہ توبہ کرنے والے، عبادت گزار، حمد وثنا کرنے والے، اس کی راہ میں سیاحت کرنے والے، رکوع اور سجدہ کرنے والے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دینے والے اور اللہ کے حدود کے پابند رہنے والے ہیں۔ (التوبۃ: ۱۱۲)

کیا یہ اعلیٰ صفات ہمارے اندر ہیں۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان صفات کے حاملین ہی جنت کے مستحق ہوں گے۔ اور انھیں کی جدوجہد سے دنیا میں مطلوبہ تبدیلی آئے گی۔ یہ آیات ہم سے سوال کر رہی ہیں کہ تم بھی یہاں کے نظام حیات میں تبدیلی چاہتے ہو، کیا یہ اوصاف تمھارے اندر ہیں؟ اس کا ہمارے پاس کیا جواب ہے!

پیغمبرانہ اوصاف

ان صفات کا تذکرہ ان کی اس خوبی کے بیان پر ختم ہو رہا ہے: 'والحافظون لحدود للّٰہ'۔ یہ بہت ہی جامع صفت ہے، جو مذکورہ تمام اوصاف اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے جو بیع کی ہے اسے پوری کرتے ہیں۔ اللہ کے قائم کردہ فرائض کی ہر حال میں نگہ داشت کرتے ہیں کہ وہ چھوٹنے نہ پائیں اور جن امور سے

منع کیا گیا ہے ان کا ارتکاب نہیں کرتے۔آیت کے آخری الفاظ ہیں: وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ مطلب یہ کہ اہلِ ایمان کو جس بیع پر جنت کی بشارت دی گئی تھی وہ انھیں حاصل ہوگئی۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم نے بھی جنت کے عوض اپنی جان و مال فروخت کردیے ہیں۔کیا ہم اپنے عمل سے اس کا ثبوت دے رہے ہیں۔اللہ کے خاص بندوں کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (البقرۃ:۲۰۷)

لوگوں میں سے بعض وہ بھی ہیں جو اپنے نفس کو اللہ کی خوش نودی کے لیے فروخت کردیتے ہیں۔

کیا اس کا ثبوت ہم اپنے قول وعمل سے دے رہے ہیں؟ اس کا فقدان یا کمی ہے تو ہمارے اندر یہ جذبہ اور تڑپ ہونی چاہیے کہ ہم اللہ کے ان جاں نثار بندوں میں شامل ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے جو رسول دنیا میں آئے وہ اس کے محبوب ترین بندے تھے۔اس کے دین کے لیے ان کی جدوجہد اور قربانیوں کا قرآن نے بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ خانوادۂ ابراہیمؑ کا ذکر ہے۔ان کے اوصاف بیان ہوئے ہیں:

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝۹۰ (الانبیاء:۹۰)

وہ امورِ خیر میں تیزی دکھاتے تھے اور ہمیں امید و بیم کے ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے سامنے جھک جاتے تھے۔

ہم ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ کیا یہ پیغمبرانہ اوصاف یا ان کا پرتو ہی ہمارے اندر ہے۔کیا خیر کے کاموں کی طرف ہماری سبقت ہے۔کیا اللہ کے انعامات کی امید اور اس کے عذاب کا خوف ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔کیا ہمارے اندر خشوع اور اللہ کے سامنے سر جھکانے کی کیفیت پائی جاتی ہے؟

ان ہی اوصاف کے حامل دین و شریعت کے حامل ہوتے ہیں اور زمین کا اقتدار بھی ان ہی کے حوالہ ہوتا ہے۔

دنیا کا کامیاب ترین اور خوش قسمت انسان وہ ہے جسے راہِ ہدایت مل جائے۔

بدنصیب ہے وہ جو ہدایت سے محروم ہے۔ ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ (البقرۃ:۲۱۳)

اللہ جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔

یہی حقیقت ایک اور جگہ ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾ (یونس:۲۵)

اللہ دارالسلام (جنت) کی طرف بلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت فرماتا ہے۔

آدمی راہِ ہدایت ہی کے لیے نماز میں دعا کرتا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ اس شخص کو راہِ ہدایت دکھاتا ہے جس کے اندر انابت ہو اور جو اس کی طرف رجوع کرے۔

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ (الشوریٰ:۱۳)

اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے نبوت کے لیے چن لیتا ہے اور ہدایت اسے دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع ہو۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ (الرعد:۲۷)

ہدایت اسے دیتا ہے جس کا اس کی طرف رجوع ہو۔

یہ اوصاف آدمی کو ہدایت کا مستحق بناتی ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انھیں اپنے اندر پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی جائے۔ امید ہے اس سے راہ ہدایت کھل جائے گی۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾ (محمد:۱۷)

جن لوگوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ فرمایا اور ان کو ان کا تقویٰ اور پرہیزگاری عطا کی۔

بعض دینی حلقوں میں اصلاح وتربیت کا محدود تصور ہے۔ ہم اسے غلط سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید نے تزکیہ کا وسیع تصور دیا ہے، جو پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں تعلق باللہ، انابت، اخلاص، توبہ واستغفار، ذکرِ الٰہی، تفکر وتدبر، عبادات، اخلاق، معاملات،

خدمتِ خلق، دعوتِ دین، اللہ کے دین کی سربلندی کی جدوجہد سب ہی انفرادی اور اجتماعی کوششیں آتی ہیں۔

جائزہ اور احتساب کی ضرورت

اس بات کا مسلسل جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ ان تمام پہلوؤں سے ہمارا کیا حال ہے؟ ہمیں کس مقام پر ہونا چاہیے اور کس جگہ ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اللہ کے نیک بندوں کا وصف یہ ہے کہ وہ کھڑے بیٹھے، سوتے جاگتے اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ کسی حال میں اس سے غافل نہیں ہوتے۔ ان کے اندر ذکر کے ساتھ فکر وتدبر بھی ہوتا ہے۔

اَلَّذِيۡنَ يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰى جُنُوۡبِهِمۡ وَيَتَفَكَّرُوۡنَ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ۚ (آل عمران:۱۹۱)

وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں قیام وقعود کی حالت میں اور اپنے پہلوؤں پر (سوتے ہوئے) اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں۔

وہ کائنات میں پھیلے ہوئے آثارِ قدرت پر غور کرتے ہیں اور بارگاہِ الٰہی میں زمزمہ سنج ہوتے ہیں:

رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۹۱ (آل عمران:۱۹۱)

اے ہمارے رب! تونے یہ دنیا بے مقصد نہیں بنائی ہے۔ تیری ذات ہر نقص سے پاک ہے۔ توہمیں عذاب جہنم سے بچالے۔

کیا ہمارے شب وروز میں کچھ ایسے لمحات بھی ہوتے ہیں جب کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اس عظیم کائنات پر غور وفکر کی نگاہ ڈالیں اور اس کی یاد دل میں تازہ ہوجائے۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی دعوت، اس کے لیے ان کی فکرمندی، جدوجہد، کدوکاوش اور اس راہ کی مشکلات پر صبر وثبات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا اعلیٰ کردار اس دعوت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ ان کی پاکیزہ سیرت ان کی دعوت کی عملی تصدیق کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اسوہ اس میں زیادہ واضح ہے۔ آپ کی حیاتِ طیبہ، آپ کی شب وروز کی زندگی اور آپ کا اسوۂ حسنہ قرآن وحدیث

میں محفوظ ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کے اوصاف بھی ان میں بیان ہوئے ہیں۔ داعیانِ دین کو دیکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا دین ان سے کن اوصاف کا مطالبہ کرتا ہے، وہ ہمارے اندر کیا خوبیاں دیکھنا چاہتا ہے۔ کن کم زوریوں سے اس کے نزدیک ہماری زندگی پاک ہونی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے دنیا کی اصلاح کو تو اپنے سامنے رکھا ہے، لیکن اپنی ذات کو ہدف نہیں بنایا۔ اس لیے ہمارے اندر مطلوبہ اوصاف پروان نہیں چڑھ رہے ہیں۔ ہم جس مقام پر کل تھے آج بھی اسی جگہ ہیں۔ اس میں پیش رفت نہیں ہو رہی ہے۔ قرآن اور سیرت میں ہماری تمام کم زوریوں کا علاج ہے۔ ہمیں ان کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔

ذمہ دارانِ جماعت کا ذاتی تزکیہ

تزکیہ کے معنیٰ پاک صاف کرنے، نشو ونما اور ترقی دینے کے ہیں۔ اس کا واحد ذریعہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور ان کی معصیت سے اجتناب ہے۔ اسی سے فکر و عمل میں تازگی آتی ہے اور اعلیٰ سیرت و کردار کی نشو ونما ہوتی ہے۔ یہی تزکیہ وطہارت ہے، یہی ذاتی اصلاح و تربیت کا ذریعہ ہے اور اسی سے شخصیت کا صحیح معنیٰ میں ارتقا (Personality Development) ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے اصولی بات یہ کہی:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا۝ (الاحزاب:۷۱)
جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے وہ بڑی کام یابی پائے گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ۝ (النور:۵۲)
جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور اس سے ڈر کر چلیں وہی کام یاب اور بامراد ہیں۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ تزکیہ اصلاً انسان کا ذاتی عمل ہے۔ اسی سے اس کی کام یابی وابستہ ہے۔ اس کے ذریعہ وہ خود کو دینی اور اخلاقی لحاظ سے اوپر اٹھاتا ہے، کسی دوسرے پر احسان نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ۝ (فاطر:۱۸)
جو شخص پاکی حاصل کرتا ہے وہ اپنے لیے پاکی حاصل کرتا ہے اور اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہماری خوبیوں اور کم زوریوں سے اچھی طرح واقف ہے۔اس کی توفیق ہی سے راہِ حق کے مشکل مراحل طے ہو سکتے ہیں۔سورۂ نجم میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۝ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝

(النجم: ۳۱، ۳۲)

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اللہ ہی سب کا مالک ہے، اسے قدرت ہے کہ بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے برے عمل کیے اور جن لوگوں نے نیک اعمال کیے انھیں بہتر جزا دے۔ وہ جو بڑے گناہوں اور فواحش سے بچتے ہیں۔ہاں ان سے چھوٹی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ بے شک تمھارا رب بڑا مغفرت والا ہے۔وہ خوب جانتا ہے تم کو جب کہ اس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی حالت میں تھے۔لہٰذا اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہ کرو۔ وہ خوب جانتا ہے کون صاحبِ تقویٰ ہے۔

ان آیات میں بعض اہم حقیقتیں بیان ہوئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہی آسمان اور زمین اور ان کے اندر پائی جانے والی تمام چیزوں کا مالک ہے۔ وہی ان کا خالق ہے، سب کی موت وحیات اسی کے قبضے میں ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کائنات میں تصرف کرتا ہے۔ اس کے اقتدار اور قدرتِ کاملہ کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔وہ مالک حقیقی آخرت میں انسانوں کو ان کے اعمال کی جزا یا سزا دے گا۔غلط کار برے انجام سے دوچار ہوں گے اور جن کی زندگی تقویٰ اور احسان کی زندگی تھی انھیں اپنے حسنِ عمل کا بہترین صلہ ملے گا۔ یہ وہ محسنین ہیں جو کبائر سے اور فواحش سے اجتناب کرتے ہیں۔البتہ ان سے چھوٹی موٹی کوتاہیاں ہو سکتی ہیں جن سے کوئی بھی انسان محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے 'اِلَّا اللَّمَمَ' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔اس کی اہلِ علم نے جو تشریح کی ہے اس کا

خلاصہ یہ ہے کہ 'لمم' سے مراد صغائر ہیں۔ وہ ناپسندیدہ اعمال ہیں جن کی شریعت میں کوئی حد مقرر نہیں ہے یا جن پر کوئی وعید نہیں آئی ہے۔ البتہ یہ اس وقت معاف ہوتے ہیں جب کہ ان پر اصرار نہ ہو۔ وقتی جذبہ سے ان کا ارتکاب ہو جائے تو آئندہ ان سے بچنے کا ارادہ ہو۔

(تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔قرطبی الجامع لاحکام القرآن: جلد ۹، جز ۱۷، ص ۷۰، ۷۱)

آدمی کبائر سے اجتناب کرے اور صغائر سے بھی ممکنہ حد تک دور رہے تو اسے اپنے تقویٰ اور خداترسی پر مطمئن ہونا یا اترانا زیب نہیں دیتا۔ اس لیے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کے اندر حقیقی معنیٰ میں تقویٰ ہے اور کون اس سے تہی دامن ہے۔ اس لیے کہا گیا کہ اللہ کا علم بڑا وسیع ہے۔ وہ اس وقت سے تمھیں جانتا ہے جب اس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، جب تم ماں کے پیٹ میں جنین کی حالت میں تھے اس کے بعد تم دنیا میں آئے۔ وہ تمھارے ہر مرحلۂ حیات سے واقف ہے۔ اس کے سامنے اپنی پارسائی اور پاک بازی کا اظہار نہ کرو۔

اس طرح یہ آیات تقوی اور نیکی پر کبر کی جگہ عجز وانکسار کی تعلیم دیتی ہیں۔ یہی کم زور انسان کے شایانِ شان ہے۔ بندہ ہونے کا احساس اور اپنی کم زوریوں کو دور کرنے کی فکر ہی تزکیہ کی بنیاد ہے۔ اسی سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ مبارک

اللہ سے محبت سرمایۂ ایمان ہے۔ ارشاد ہے کہ اللہ سے محبت کا دعویٰ ہے تو اس کا ثبوت اطاعتِ رسول کی شکل میں دینا چاہیے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱ (آلِ عمران: ۳۱)

کہہ دو، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ معاف کردے گا۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اتباعِ رسول ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ آپ

کی اتباع میں آپ کے احکام وہدایات کی اتباع اور آپ کی سیرت کی اتباع دونوں ہی شامل ہیں۔آپ کی زندگی ہر پہلو سے نمونہ تھی۔کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں عدمِ اطاعت کا رویہ اختیار کیا جاسکے۔اسی وجہ سے کہا گیا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (الاحزاب:۲۱)	تمھارے لیے رسول اللہ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے ہراس شخص کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھے اور اللہ کو کثرت سے یاد کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ عبادات میں، سیرت واخلاق میں، انسانی تعلقات میں، دعوت وتبلیغ میں، راہِ حق میں استقامت میں، جنگ اور امن میں، زندگی کے ہر میدان میں ہر پہلو سے نمونہ ہے۔آپ کا اسوہ ہر صاحبِ ایمان کے سامنے ہونا چاہیے۔یہ اللہ اور آخرت پر ایمان کا صریح تقاضا ہے۔کوئی گوشۂ حیات ایسا نہیں ہے، جس میں عدمِ اطاعت کا رویہ اختیار کیا جاسکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے دو پہلو ہیں: ایک ہے اللہ تعالیٰ سے آپ کا قلبی تعلق اور وابستگی۔ دوسرا ہے اللہ کے دین کے لیے آپ کی جدوجہد اور استقامت۔ دونوں کی اہمیت ہے۔ دونوں کا ایک دوسرے سے گہرا ربط وتعلق ہے۔ وہ ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔لیکن ہمارے سامنے بالعموم دوسرا پہلو ہوتا ہے۔وہی زیادہ تر ہمارے غور وفکر اور بحث وگفتگو کا موضوع قرار پاتا ہے۔ہم یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ دعوت وتبلیغ اور دین کی سربلندی کی جدوجہد کے لیے اللہ تعالیٰ سے تعلق کا مضبوط ہونا انتہائی ضروری ہے۔ قرآن مجید نے بار بار یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق ہی دعوتی جدوجہد میں سب سے بڑا سہارا ہے۔اسی سے استقامت اور مشکلات پر قابو پانے کا عزم اور حوصلہ ملتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کی تعلیم دی گئی اور آپ کی حیاتِ مبارکہ اسی کی شہادت دیتی ہے۔

رسالت کے ابتدائی دور میں سورۂ مزمل نازل ہوئی۔اس کا آغاز ہی نمازِ تہجد کے حکم سے ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝١ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝٢ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝٣ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝٤ (المزمل:۱۔۴)

اے چادر میں لپٹنے والے، اٹھو، رات میں قیام کرو، ہاں تھوڑی دیر آرام بھی کرو۔آدھی رات یا اس سے کسی قدر کم یا اس سے کچھ زیادہ۔قرآن ترتیل (ٹھہر ٹھہر کر) کے ساتھ پڑھو۔

آگے ارشاد ہے:

اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝٥ (المزمل:۵)

بے شک ہم آپ پر ایک 'قول ثقیل' ڈالنے والے ہیں۔

'قول ثقیل' سے مراد قرآن مجید ہے۔دنیا میں اس سے زیادہ گراں بار ذمہ داری اور کوئی نہیں ہے کہ قرآن کو دنیا کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیا جائے کہ فکر وعمل کو اس کا پابند ہونا چاہیے اور پوری زندگی کی تعمیر اس کی ہدایت کے تحت ہونی چاہیے۔فرمایا اسی کے لیے نماز تہجد ہے۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝٦ (المزمل:۶)

بے شک رات کا اٹھنا نفس کو اچھی طرح روندتا اور اس قابل بناتا ہے کہ بات کو اچھی طرح ادا کیا جائے۔

اس کے بعد فرمایا:

اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝٧ (المزمل:۷)

آپ کو دن میں طویل مصروفیت ہے۔

یہ مصروفیت ذاتی بھی ہے اور دعوتی بھی۔اس لیے جو یکسوئی اوقاتِ شب میں حاصل ہوتی ہے وہ دن میں ممکن نہیں ہے، اس لیے حکم ہوا کہ رات اللہ کی یاد میں گزاری جائے آگے ارشاد ہے:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝٨ (المزمل:۸)

اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہو اور اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

آیت میں ذکر کے ساتھ 'تَبَتَّلْ' کا حکم ہے۔تبتل کے معنی ہیں ہر طرف سے کٹ کر اللہ کی عبادت میں لگ جانا۔یہ رہبانیت کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کے معنیٰ ہیں علائقِ دنیا سے خود کو الگ کر کے اللہ کی طرف توجہ کرنا اور کبھی اس سے غافل نہ ہونا۔

فرمایا:

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَفَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴿٩﴾ (المزمل:۹)

وہ مشرق ومغرب کا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں تم اسے اپنا وکیل اور کارساز بناؤ۔

جو لوگ تم سے بدزبانی کررہے ہیں اور جو اپنی خوش حالی اور عیش وعشرت میں مست ہیں انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو، ہم ان کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ ہماری گرفت سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ (المزمل:۱۰-۱۱)

یہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ نماز تہجد اور شب بے داری، اللہ سے قربت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اسی سے وہ توانائی حاصل ہوگی جو کتابِ الٰہی کی تبلیغ کے لیے ضروری ہے۔ اسی سے اس راہ کی دشواریوں کو برداشت کرنا آسان ہوگا۔ اسی سے اللہ کی نصرت وحمایت حاصل ہوگی۔

قرآن مجید میں یہ مضمون بہ کثرت بیان ہوا ہے۔ سورۂ حجر کے آخر میں ارشاد ہے کہ آپ کو جو حکم دیا جارہا ہے اس کا برملا اظہار کیجیے۔ جو لوگ آپ کا مذاق اڑا رہے ہیں، ان کے لیے ہم کافی ہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿٩٧﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿٩٩﴾ (الحجر:۹۷-۹۹)

ہم خوب جانتے ہیں کہ جو (بے ہودہ) باتیں وہ کرتے ہیں اس سے آپ کے دل کو سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ (اس کے لیے) آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور سجدہ کرنے والوں میں شامل ہوجائیے۔ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے۔ یہاں تک کہ وقتِ یقین آجائے۔(۱)

---

(۱) یہاں یقین سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک موت ہے۔ اس لیے کہ موت ایک یقینی اور حتمی چیز ہے۔ یعنی زندگی کے آخری لمحے تک اللہ کی عبادت کرتے رہیے۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اس سے مراد اللہ کی طرف سے جو وعدے کیے گئے ہیں اور جن کا پورا ہونا یقینی ہے، آپ اللہ کی عبادت میں لگے رہیے۔ آپ اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھ لیں گے۔

سورۂ طور میں ارشاد ہے:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ﴿٤٨﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ﴿٤٩﴾ (الطور:۴۸،۴۹)

اور صبر کیجیے اپنے رب کے فیصلے کا۔ بے شک آپ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں اور اپنے رب کی حمد کیجیے تسبیح کے ساتھ جب آپ (نماز کے لیے) کھڑے ہوں اور رات کے ایک حصہ میں اس کی تسبیح کیجیے اور تاروں کے ڈوبنے کے بعد بھی۔

سورۂ شعراء کی آیات ہیں:

فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٢١٦﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ﴿٢١٧﴾ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ﴿٢١٨﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ﴿٢١٩﴾ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٢٢٠﴾ (الشعراء:۲۱۶-۲۲۰)

پھر بھی اگر وہ تمھاری نافرمانی کریں تو کہہ دو کہ تم جو کچھ کررہے ہو میں اس سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔ اور بھروسہ کرو اس پر جو زبردست اور رحم کرنے والا ہے۔ جو دیکھتا ہے تم کو جب تم کھڑے ہوتے ہو۔ (نماز کے لیے اٹھتے ہو) اور سجدہ کرنے والوں کے درمیان تمھاری گشت ہوتی ہے۔ بے شک وہی ہے سننے والا اور جاننے والا۔

سورۂ قٓ میں ارشاد ہے:

فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ﴿٣٩﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ ﴿٤٠﴾ (قٓ:۳۹،۴۰)

پس یہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں، اس پر صبر کرو اور تسبیح کرو اپنے رب کی حمد کے ساتھ۔ آفتاب کے طلوع سے قبل اور غروب سے قبل اور رات میں بھی اس کی تسبیح کرو اور سجدے کے بعد بھی۔

اس میں پانچ وقت کی نماز کے اوقات اور نماز تہجد کی طرف اشارہ ہے اور ان کی پابندی کا حکم ہے۔ نماز کے بعد بھی ذکر کی ہدایت کی گئی ہے۔

ان آیات میں بار بار ہدایت کی گئی ہے کہ مخالفین کی ہرزہ سرائی اور بے ہودہ باتوں پر صبر کیجیے اور اللہ کے ذکر اور تسبیح کا اہتمام کیجیے۔ اس سے مخالف حالات میں استقامت حاصل ہوگی اور اللہ کی مدد شاملِ حال ہوگی۔

یہ بات سورۂ طٰہٰ میں بھی کہی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۱۳۰۔

ہم کبھی کبھی سوچتے ہیں کہ دعوت وتبلیغ کا سرفروشانہ جذبہ ہم میں کیوں نہیں ہے، کیوں دین کی دعوت اور سربلندی کے لیے وہ فکر اور تڑپ نہیں ہے جو ہونی چاہیے۔ لیکن یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ اس کا سرچشمہ اللہ سے تعلق ہے۔ یہ جب تک استوار نہ ہو مطلوبہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس کی کوئی دوسری سبیل ہی نہیں ہے۔

عملی کوتاہی

تزکیہ کے پہلو سے اپنی کم زوریوں کا بھی ہمیں جائزہ لینا چاہیے۔

نماز کی اہمیت سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ ایمان باللہ کے بعد اولین مطالبہ اسی کا ہے۔ ہم نماز کی اس اہمیت کا ذکر کرتے ہیں۔ نماز باجماعت اور اس کی فضیلت کا تذکرہ بھی ہمارے درمیان ہوتا رہتا ہے۔ سوچیے کہ کیا ہم اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ نماز کی باطنی کیفیت کو خشوع وخضوع سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن ہماری نمازیں اس سے خالی ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ ہماری مجالس کا ایک اہم موضوع ہوتا ہے۔ اللہ کا دین جب نازک اور سخت حالات سے گزر رہا ہو تو حکم ہے کہ آدمی اپنی لازمی ضروریات پوری کرنے کے بعد باقی مال و دولت اللہ کی راہ میں لگا دے۔ ارشاد ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ	وہ تم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہو،
(البقرۃ:۲۱۹)	جو تمھاری ضروریات سے زیادہ ہو۔

اس وقت اسلام ملکی اور بین الاقوامی سطح پر شدید حالات سے دوچار ہے۔ ان حالات میں اسلام کی ہمہ جہت خدمت کے لیے مالی تعاون کی بڑی اہمیت ہے۔ کیا انفاق کا مطلوبہ جذبہ ہمارے اندر پایا جاتا ہے؟

دین کے لیے جان، مال، وقت اور صلاحیت لگانے کا ہماری زبان پر چرچا رہتا ہے، لیکن ہماری زندگی سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس سے ہمارا ارتقا کیا ہوگا اور ہم سے

وابستہ رفقا پر اس کا کیا اثر ہوگا؟۔قرآن کہتا ہے کہ بے عملی کے ساتھ تبلیغِ دین خدا کے غضب کو دعوت دیتی ہے۔

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴿۳﴾ (الصّف:۲،۳)

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، ایسی (اونچی) باتیں کیوں کرتے ہو جن پر تم عمل نہیں کرتے۔ اللہ کے نزدیک یہ اس کے غصہ کو بڑھانے والی حرکت ہے کہ ایسی باتیں کرو جن پر عمل نہ کرو۔

اہل کتاب سے کہا گیا:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴿۴۴﴾ (البقرۃ:۴۴)

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو اور کتاب کی تلاوت (بھی) کرتے ہو۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔

ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کہیں ہم اس کی زد میں تو نہیں آ رہے ہیں؟

ذمہ داروں کو نمونہ ہونا چاہیے

رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پوری امت کے لیے اسوۂ حسنہ تھی۔ذمہ دارانِ جماعت کو اپنے دائرے میں اسلامی سیرت و کردار کا نمونہ ہونا چاہیے۔ان کی زندگی عام انسانی کم زوریوں سے پاک ہونی چاہیے۔انھیں عبادات میں، اخلاق میں، رفقا سے تعلقات میں، جان، مال اور وقت کی قربانی میں دوسروں کے لیے نمونہ ہونا چاہیے۔ازواجِ مطہرات سے کہا گیا:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴿۳۲﴾ (الاحزاب:۳۲)

اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ کی روش اختیار کرو۔لہٰذا کسی سے بات کرتے وقت نرمی اور لوچ نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں مرض ہے وہ برا خیال کرنے لگے اور معروف کی بات کرو۔

مطلب یہ کہ تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، تم نبی ﷺ کی ازواج ہو۔ تم امت کے لیے نمونہ ہو۔ تم سے دنیا سبق حاصل کرے گی اور سیکھے گی۔ تمھارا اخلاق و کردار سب سے بلند ہونا چاہیے۔ تمھیں بات چیت اور اظہارِ خیال میں ایسا انداز نہیں اختیار کرنا چاہیے کہ کسی بدطینت کے دل میں تمھارے بارے میں کوئی غلط خیال آنے لگے۔ تمھاری بات چیت معروف پر مبنی اور ہر شائبۂ منکر سے پاک ہو۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ذمہ داروں کا قول و عمل دوسروں کے لیے نمونہ ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں اخلاق و کردار کے پہلو سے اعلیٰ مقام پر کھڑا ہونا چاہیے۔

دنیا ضرورت کی حد تک

اسلام نے رہبانیت کی تعلیم نہیں دی ہے۔ وہ دنیا کو آخرت کی کام یابی کا ذریعہ دیکھنا چاہتا ہے۔ جائز ذرائع سے دنیا حاصل کرنا غلط نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اسلام یہ بھی نہیں چاہتا کہ آدمی دنیا ہی کا ہو رہے۔ خاص طور پر تحریکی ذمہ داروں کو دنیا کی قربانی دینی ہوگی اور اس کے لیے جو نقصان برداشت کیا جاسکتا ہے وہ برداشت کرنا چاہیے۔ آسائش و راحت کی تلاش کے ساتھ دین کی دعوت اور سربلندی کی جدوجہد کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ خدا کے نافرمان شب و روز دادِ عیش دے رہے تھے اور لطفِ حیات میں سرشار و مست تھے۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ ان کے سامانِ عیش کو ہرگز نہ دیکھیں، یہ ان کے لیے فتنہ ہے۔ اس میں ان کا امتحان ہو رہا ہے۔ آپ کے سامنے آخرت کی کام یابی ہونی چاہیے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیات ہیں:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿١٣١﴾ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ

آپ ہرگز طرح طرح کے اس ساز و سامان کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں جو ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو زینتِ دنیا کے طور پر دیا ہے، تاکہ ان کی آزمائش کریں۔ تمھارے رب کا رزق بہتر اور پائے دار ہے۔

عَلَيْهَا ۭ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿١٣٢﴾ (طٰہٰ: ۱۳۱، ۱۳۲)	اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دیجیے اور اس پر جمے رہیے۔ ہم آپ سے رزق نہیں چاہتے۔ہم آپ کو رزق دیں گے۔بہتر انجام تو تقویٰ ہی کا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس کا نمونہ تھی۔دنیا آپ کے قدموں میں تھی۔آپ نے اس کی طرف کبھی رخ نہیں کیا۔آخرت کی فوز وفلاح کو متاعِ دنیا پر ترجیح دی۔ داعیانِ دین سے یہی کردار مطلوب ہے۔

انابت اِلیٰ اللہ

خطبۂ عید الفطر

شنبہ، یکم شوال ۱۴۳۹ھ، مطابق ۱۶/ جون ۲۰۱۸ء

حمد وصلوٰۃ کے بعد۔

بزرگو، بھائیو اور عزیزو، محترم خواتین، ماؤ، بہنو اور بیٹیو!

وَ لاَ تَهِنُوْا وَ لاَ تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (آل عمران:۱۳۹)

کمزوری نہ دکھاؤ، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے، اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

میں آپ تمام بھائیوں اور بہنوں کو عید کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ پوری دہلی کے برادرانِ اسلام کو، بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو عید کی مبارک باد دیتا ہوں۔ حالات جیسے بھی ہوں، عید منانے کا حکم ہے اور ہم اس کی تعمیل کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

ہم بقدر استطاعت مکلّف ہیں

محترم حضرات وخواتین!

ہمارے مسائل ہیں اور بہت سنگین مسائل ہیں۔ ان کو حل کرنے کی ہم کوشش بھی کر رہے ہیں۔ یہ کوشش جاری رہنی چاہیے۔ اس میں کوتاہی صحیح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن:۱۶)

اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو، جتنی تمھارے اندر استعداد ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس نے ہم پر طاقت سے زیادہ بار نہیں ڈالا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کرنی ہوگی کہ جو کچھ ہمارے اختیار میں تھا وہ ہم نے لگا دیا اور جو نہیں کر سکے وہ ہماری طاقت سے باہر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں نماز روزے کا حکم دیا ہے، زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کی ہدایت کی ہے، استعداد ہو تو حج فرض کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ بیوی بچوں کی اصلاح کی کوشش کی جائے، انھیں فتنہ نہ بننے دیا جائے۔ اس نے کہا ہے کہ امت کے ساتھ خیر خواہی کی جائے اور اسے دین پر قائم رکھنے کی سعی کی جائے۔ اس نے تبلیغِ دین اور اس کی سربلندی کے لیے جدّ وجہد اور اس کے لیے تکلیفیں برداشت کرنے کی ہدایت کی ہے۔ ہم سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ کل قیامت کے روز کیا ہم کہہ سکیں گے کہ ان امور کی انجام دہی کے لیے ہمارے اندر جو توانائی تھی وہ ہم نے صرف کر دی اور جو نہ کر سکے وہ ہماری طاقت سے باہر تھا۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کیا کچھ ہماری استعداد میں تھا؟ اور کیا ہماری استعداد سے باہر تھا؟ اس کا حکم ہے:

وَجَاهِدُوْا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط هُوَاجْتَبٰكُمْ (الحج:۷۸)

اللہ کے راستہ میں جدّ وجہد کرو جس طرح جدّ وجہد کا حق ہے۔ اس کے لیے اس نے تمھیں منتخب کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا دین کے لیے جدّ وجہد کا حق ادا ہو رہا ہے؟

نصرتِ الٰہی کے بغیر کوئی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی

دوستو اور ساتھیو!

موجودہ حالات میں ہمیں ہر طرح کے مشورے دیے جاتے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ کم زوروں ہی کو مشورے دیے جاتے ہیں۔ اس میں ترحّم اور ہم دردی کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ جو طاقت ور ہے وہ مشوروں کی ضرورت نہیں محسوس کرتا، بلکہ اس سے مشورے لیے جاتے ہیں اور اس کی تقلید میں فخر محسوس کیا جاتا ہے۔

قرآن کہتا ہے اور بار بار کہتا ہے:

وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○ اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔

(آل عمران:۱۳۹)

اگر تمھارے اندر اللہ تعالیٰ پر صحیح معنیٰ میں ایمان ہے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کے لیے تم تیار ہو تو تمھاری کم زوریاں دور ہوں گی اور تمھیں لازماً سر بلندی عطا ہوگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اس سے سچا وعدہ کس کا ہو سکتا ہے؟ کیا اس کے وعدے پر ہمیں یقین نہیں ہے؟

اس امت نے ہر طرح کے تجربے کیے، سیاسی اور غیر سیاسی کوششیں کیں، لیکن مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوئے، اس کی قسمت نہیں بدلی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل ہوتی۔ اس کے بغیر اس کی کوئی بھی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ قرآن پورے زور کے ساتھ کہتا ہے:

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ○ (آل عمران:۱۶۰)

اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمھاری مدد کرے اور اللہ ہی پر ایمان والوں کو توکل کرنا چاہیے۔

تاریخ کے اوراق اس کی تائید کرتے ہیں کہ جب اللہ کی نصرت اس امت کو حاصل رہی وہ سر بلند ہو کر رہی۔ کوئی اس پر غلبہ نہ پا سکا۔ جب اس کی نصرت سے وہ محروم ہو گئی تو کسی کی حمایت اس کے کچھ کام نہ آئی۔

نصرتِ الٰہی مشروط ہے

اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کی شرائط کی تکمیل ہو۔ اللہ تعالیٰ سے توقعات ہی نہ رکھی جائیں، بلکہ اس کی ہدایات پر عمل بھی کیا جائے۔ اس ارشاد کو غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّھُمْ يَرْشُدُوْنَ ○ (البقرۃ:۱۸۶)

جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو بتادو کہ میں قریب ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، انھیں بھی چاہیے کہ وہ میری پکار کا جواب دیں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ توقع ہے، وہ ہدایت پائیں گے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے قریب ہے۔ وہ ان کی دعائیں سننے کے لیے ہر آن تیار ہے۔ شب و روز کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں وہ ان کی دعا نہ سنتا ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ بندے بھی اس کی آواز پر لبیک کہیں اور اس کی اطاعت کے لیے تیار ہوں۔ یہی راہِ راست ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان رشد و ہدایت سے سرفراز ہے۔

اہلِ کتاب سے کہا گیا:

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ○ (البقرۃ:۴۰)

پورا کرو میرے عہد کو جو تم نے مجھ سے کیا ہے، میں تم سے کیے گئے عہد کو پورا کروں گا اور صرف مجھ سے ڈرتے رہو۔

یعنی یہ کہ تم نے مجھ سے عہد کیا تھا کہ احکامِ شریعت کے پابند رہو گے، اسے پورا کرو، میں نے تم سے جو عہد کیا تھا اسے میں پورا کروں گا اور تمھیں دنیا اور آخرت میں سرخ رو اور کام یاب کروں گا۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کے دین کی حمایت میں آپ کھڑے ہوں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ○ (محمد:۷)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ (کے دین) کی نصرت کرو گے تو اللہ تمھاری نصرت فرمائے گا اور تمھارے قدموں کو ثبات عطا کرے گا۔

اہلِ ایمان کی پہچان

بزرگو اور دوستو!

اب آیئے دیکھیں کہ کیا ہمارا ایمان وہی ایمان ہے جس کا ہم سے مطالبہ کیا گیا

ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے۔قرآن کہتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ (الحجرات:۱۵)

مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ، پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کے راستہ میں جہاد کیا۔یہی سچے اور راست باز ہیں۔

ایمان وہ معتبر ہے جس سے یقین واذعان ابل رہا ہو، جس میں اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات پر شک وتردّد کی پرچھائیاں تک نہ پڑی ہوں اور جو انسان کو اللہ کے راستے میں جان اور مال کی قربانی کے لیے آمادہ کرے۔جس کا یہ حال ہو وہی اپنے دعوائے ایمان میں مخلص اور سچا ہے۔

ایک جگہ فرمایا گیا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الانفال:۲)

مومن تو بس وہی ہیں، جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہلنے لگتے ہیں۔

اہلِ ایمان کی پہچان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے تو اس کی عظمت وہیبت سے ان پر لرزش طاری ہوجاتی ہے، اس کی قدرت و طاقت کے تصوّر سے وہ کانپ اٹھتے ہیں۔اس دنیا میں آدمی اقتدارِ وقت سے ڈرتا ہے،حکومت سے خوف کھاتا ہے،اس کے حکم کی خلاف ورزی ہو تو معافی کا طلب گار ہوتا ہے،معافی کی توقع نہ ہو تو روپوش ہوجاتا ہے، دوسرے ملکوں سے پناہ کا طالب ہوتا ہے،لیکن اللہ تعالیٰ سے آدمی کہاں راہِ فرار اختیار کرے گا۔یہاں ہر طرف اسی کی حکومت اور فرماں روائی ہے۔اس کی گرفت سے بچ کر نکلنا ممکن نہیں ہے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ○ (الرحمٰن:۳۳)

اے گروہِ جن وانس !اگر تم آسمانوں اور زمین کے اطراف سے نکل کر جاسکو تو چلے جاؤ،لیکن تم نہیں جاسکتے۔اس کے لیے جو اقتدار اور طاقت چاہیے وہ تمھیں حاصل نہیں ہے۔

زمین و آسمان پر اور پوری کائنات پر اللہ کی حکومت ہے۔ کسی میں یہ زور نہیں ہے کہ اس کے حدودِ مملکت سے باہر نکل سکے۔

اس کائنات میں اللہ تعالیٰ سے بڑی کوئی ہستی نہیں ہے کہ اس سے انسان کو ڈرایا جائے، اس کی قدرت سے زیادہ کسی کی قدرت نہیں کہ اس کا خوف دلایا جائے، لیکن افسوس کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کا دعویٰ کرنے والے بھی اس کی قوت و اقتدار کا تصوّر نہیں کرتے اور اس سے خوف نہیں کھاتے۔

اہلِ ایمان کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے:

وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (الانفال:۲)

جب انھیں اللہ کی آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کرتی ہیں اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

اللہ کی آیات سن کر ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور راہِ حق زیادہ وضاحت سے ان کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ خیال ذہن کے کسی گوشے میں نہیں ابھرتا کہ اس پر عمل کی وجہ سے ہم پریشانی میں پڑ گئے۔ سخت سے سخت حالات میں بھی، جب کہ دین پر چلنا دشوار ہو، ان کا ایمان غیر متزلزل ہوتا ہے اور انھیں اطمینان ہوتا ہے کہ حق یہی ہے اور اسی میں ہماری کامیابی ہے۔ انھیں اسبابِ دنیا پر نہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل ہوتا ہے کہ وہ ہمارے مسائل حل کرے گا اور ہماری دشواریاں دور فرمائے گا۔

جنگِ خندق میں مدینہ پر دشمنوں نے ہر طرف سے یلغار کر دی اور محسوس ہو رہا تھا کہ مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ اس وقت اہلِ ایمان پر اللہ کے توکّل کا یہ عالم تھا کہ وہ پکار اٹھے کہ یہی اللہ کی رحمت کے نزول اور اس کے وعدوں کی تکمیل کا وقت ہے:

وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ؗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝ (الاحزاب:۲۲)

اور جب ایمان والوں نے لشکروں کو دیکھا تو کہا کہ یہ تو وہ چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا۔ اس نے ان کے ایمان اور اطاعت کے جذبہ میں اضافہ ہی کیا۔

دوستو اور ساتھیو! اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق، مالک، معبود و مسجود اور فرماں روائے حقیقی ہے۔ یہ نیل گوں آسمان، یہ چمکتے ستارے، یہ آفتاب و ماہتاب، یہ گردش کرتی ہوئی زمین، یہ شجر و حجر، یہ دریا اور پہاڑ، سب اس کے تابع ہیں۔ کسی میں مجال نہیں کہ اس کے حکم سے ذرّہ برابر سرتابی کرے، اس کی قدرت بے پایاں ہے، وہ جو چاہے وہی ہوتا ہے، اس کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے، اس کے فیصلوں کو کوئی بدل نہیں سکتا، اس کی سلطنت مشرق و مغرب، شمال اور جنوب ہر طرف ہے، وہ ہماری شاہ رگ سے بھی قریب ہے، وہ سیاہ رات سے روشن صبح نکالتا ہے، مردہ زمین کو لہلہاتے چمن میں تبدیل کر دیتا ہے۔ کائنات کے ہر گوشے سے یہ صدا بلند ہو رہی ہے کہ تم اس خدا کے ہو جاؤ، یہ دنیا تمھاری ہو جائے گی۔ پھر تمھیں کوئی زیر نہ کر سکے گا۔ یہ آواز ہر طرف گونج رہی ہے۔ کاش! ہم یہ آواز سنتے۔ ہماری دنیا بدل جاتی۔

ملک کے حالات اور ہماری ذمہ داری

پروگرام عید ملن

شنبہ ۸ رشوال ۱۴۳۹ھ، مطابق ۲۳ رجون ۲۰۱۸ء

جماعت اسلامی ہند کی جانب سے مرکز جماعت میں عید ملن کی تقریب کا ہر سال کی طرح اس سال بھی خصوصی اہتمام کیا گیا، جس میں مذہبی، سماجی اور سیاسی رہ نماؤں، سفارت خانوں کے نمائندوں اور میڈیا کی اہم شخصیات کے علاوہ خاصی تعداد میں برادرانِ وطن نے شرکت کی۔ امیر جماعت نے تمام لوگوں کا خیر مقدم کیا اور عید کی پرخلوص مبارک باد پیش کی۔ اس مناسبت سے انھوں نے جو تقریر کی تھی وہ یہاں پیش کی جارہی ہے۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

میں آپ سب کا اپنی طرف سے اور جماعتِ اسلامی ہند کی طرف سے اس مجلس میں دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔

برادرانِ اسلام! عید کی مبارک باد قبول فرمایئے۔

رمضان کے ثمرات

رمضان المبارک سے ہم بہت کچھ حاصل کرتے ہیں۔ رمضان میں ہمارا ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے، اس کی راہ میں قربانی دینے اور شدائد

برداشت کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔

رمضان میں قرآن مجید کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا احساس ابھرتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید ہماری راہ نما کتاب ہے، اسی سے ہمیں راہ نمائی حاصل کرنی چاہیے، اسی میں ہماری دنیا اور آخرت کی فلاح ہے۔

رمضان میں عبادات خاص طور پر فرض اور نفل نمازوں کی طرف ہماری توجہ بڑھتی ہے اور اللہ کی یاد تازہ رہتی ہے۔

رمضان میں ہم لغو اور غیر ضروری باتوں اور فضول کاموں سے بچتے ہیں اور اپنے اوقات کو بہتر طریقہ سے استعمال کرتے ہیں۔

رمضان، ہم دردی، غم خواری اور مواسات کا مہینہ ہے۔ اس میں دوسروں کے دکھ درد کو سمجھنے اور ان کے کام آنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ ان سب چیزوں کو باقی رہنا چاہیے۔ اس میں ہماری ذاتی فلاح بھی ہے اور امت کے مسائل کا حل بھی۔

اس وقت ہمارے سامنے برادران اسلام کے ساتھ غیر مسلم برادران وطن بھی ہیں۔ آپ سب ہی سے بعض باتیں عرض کرنی ہیں۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ضرورت

دوستو اور ساتھیو!

اس ملک کی ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ یہاں فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر فرقہ اپنی انفرادیت ختم کر کے دوسرے میں ضم ہو جائے۔ یہ غیر فطری اور ناقابلِ عمل ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ ہر گروہ اپنی انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے، دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرے۔ اس سے باہم محبت اور الفت بڑھے گی اور ایک دوسرے کے حقوق کا احترام ہوگا۔ سب مل کر ملک کی فلاح کے بارے میں سوچ سکیں گے۔ اس کے لیے سب کا تعاون حاصل ہوگا۔

ملک کی فضا کو خراب کیا جا رہا ہے

ملک میں اس ماحول کو خراب کرنے اور اس فضا کو مکدر کرنے کی کوشش بھی ہو رہی ہے۔اس وقت ملک کے ایک طبقہ میں، یا یوں کہیے، بعض لوگوں میں یہ احساس ضرورت سے زیادہ ہی ہے کہ ملک ان کا ہے، یہاں کے وسائل ان کے ہیں اور اقتدار ان کا ہے۔ترقی کے مواقع ان ہی کے لیے ہیں۔ یہاں وہ ہر طرح محفوظ ہیں، وہ جو چاہے کر سکتے ہیں۔ان پر گرفت آسان نہیں ہے۔اسی کا مظاہرہ ہے جو ہجومی تشدد (Mob Lynching) یا گائے کے تحفظ (Cow Protection) یا عبادت گاہوں پر حملوں کی شکل میں ہوتا رہتا ہے اور مختلف مواقع پر اقلیتوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے خلاف قانونی کارروائی بھی ہوتی ہے، لیکن مختلف وجوہ سے وہ غیر موثر ہے۔ایسی نہیں ہے کہ یہ لوگ اپنی جارحیت سے باز آ جائیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقلیتوں کے خلاف اس طرح کے اقدامات چند ایک ہیں۔ اتنے بڑے ملک میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔لیکن یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس سے خوف اور دہشت کا جو ماحول پیدا ہوا ہے وہ انتہائی تشویش ناک ہے۔اقلیتوں میں یہ احساس ابھر رہا ہے کہ وہ یہاں غیر محفوظ ہیں، ان کے لیے ترقی کے مواقع مفقود، یا محدود ہیں۔وہ اپنی صلاحیتوں کا بہتر استعمال نہیں کر پا رہے ہیں۔

ہماری ذمہ داری

ملک میں اقلیتوں اور کم زور طبقات کے ساتھ جو ناانصافی ہو رہی ہے اس پر بہت سے سوچنے سمجھنے والے افراد اور معروف اسکالرس وقتاً فوقتاً آواز اٹھاتے ہیں اور انسانی حقوق کے لیے متحرک تنظیمیں بھی اس کے خلاف بولتی ہیں۔

خاص بات یہ ہے کہ اب بین الاقوامی سطح پر بھی اس کا تذکرہ ہونے لگا ہے، جس

سے ملک کی تصویر بگڑتی ہے۔اس میں شک نہیں، حالات کو ٹھیک کرنا اور اقلیتوں اور کم زور طبقات کو اعتماد میں لینا حکومت کا کام ہے۔ اس کی طرف اس کی توجہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ یہ ہم سب کی بھی ذمہ داری ہے کہ ملک کی فضا کو بہتر بنائیں اور اقلیتوں میں جو خوف و ہراس پایا جاتا ہے اسے دور کریں اور ان میں اعتماد کا ماحول پیدا کریں۔اس کے لیے اپنی پوری توانائی لگانی ہوگی اور فرقہ پرست طاقتوں کا سختی سے مقابلہ کرنا ہوگا۔

باہم گفتگو اور تبادلۂ خیال کو فروغ دیا جائے

ہمارا سماج ایک تکثیری (Plural) سماج ہے، یہاں متعدد مذاہب ہیں، کلچر کا اختلاف ہے اور زبانیں بھی مختلف ہیں۔ ملک کے بہت سے مسائل ہیں۔ان کے حل کے بارے میں ہمارے درمیان اختلاف ہوسکتا ہے اور ہوگا۔ اسے برداشت کرنا ہوگا اور اس اختلاف کو حل کرنے کے لیے بحث و مباحثہ اور Dialogue کا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ ہم ایک دوسرے کو حریف سمجھنے، اس کے نقطۂ نظر کو دشمن کا نقطۂ نظر تصور کرنے کی جگہ، اسے سمجھنے کی سنجیدہ کوشش کریں۔ بحث و مباحثہ اور گفتگو سے بہت سے مسائل حل ہوتے ہیں۔ بسا اوقات اس سے عداوتیں ختم ہوتی ہیں، دوستی اور رفاقت کی راہیں کھلتی ہیں۔ کیوں نہ ہم اپنے ملک میں تقریر و تحریر کے ذریعہ آپس میں تبادلۂ خیال کا راستہ نکالیں۔اس کوشش میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا تعاون نہایت ضروری ہے۔ملک کے مفاد میں اسے تعاون کرنا ہی چاہیے۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے۔اس سے امید ہے کہ موجودہ فضا بدلے گی۔ گفتگو سے حریف طاقتیں اور ایک دوسرے کے دشمن ممالک اپنے مسائل کا حل نکال لیتے ہیں۔اس کی تازہ مثال ٹرمپ اور شمالی کوریا کے صدر کی ملاقات اور گفتگو ہے۔ مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی کا اتحاد زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ کیا ہم اپنے وطن میں باہم گفتگو اور تبادلۂ خیال سے مسائل حل نہیں کرسکتے؟ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اختلافات کو دور کرنے کے لیے ایک میز کے گرد جمع ہونے سے ہم گھبراتے ہیں؟ آخر یہ راستہ ہم کیوں نہیں اختیار کرتے؟

ملک کی سب سے بڑی خدمت

اس وقت ملک کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ نفرت اور عداوت کی جو آندھی چل رہی ہے اسے محبت، خیر خواہی اور افہام و تفہیم کی ٹھنڈی اور خنک ہواؤں میں تبدیل کیا جائے۔ اس کے لیے جرأت و ہمت کے ساتھ ہم سب کو سامنے آنا ہوگا۔ یہ مجمع، جو موجودہ حالات سے متفکر اور پریشان ہے اور حالات کو بدلنا چاہتا ہے، وہ اگر کھڑا ہو جائے تو یقین ہے کہ اس ملک کے بہی خواہ اور انسانوں کے ہم درد اس کا ساتھ دیں گے، ملک کے سارے ستم رسیدہ اس کے دوش بدوش کھڑے ہوں گے۔ جن کے حقوق پامال ہو رہے ہیں وہ اس کی صف میں نظر آئیں گے۔ اس سے ایک تحریک شروع ہوگی اور ملک کو صحیح راہ دکھائی جا سکے گی۔ وہ راہ، جس میں مساوات، عدل و انصاف اور حقوق کی پاس داری ہو اور کوئی کسی پر دست درازی نہ کر سکے۔ آیئے، اس سمت میں بڑھیں۔ یہ ملک آپ کے انتظار میں ہے۔

میں دوبارہ آپ حضرات کا اپنی طرف سے اور جماعت اسلامی ہند کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اُمتِ مسلمہ سے خطاب

ملک کی رہ نمائی کے لیے آگے آیئے

خطبۂ عیدالاضحیٰ

چہارشنبہ، ۱۰/ذی الحجہ ۱۴۳۹ھ، مطابق ۲۲/اگست ۲۰۱۸ء

حمد وصلوٰۃ کے بعد!

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○ (الانعام: ۱۶۱-۱۶۳)

کہو، بے شک میرے رب نے مجھے صراطِ مستقیم دکھائی ہے، یعنی سیدھا اور مضبوط دین، ابراہیم کی راہ، جو یک سو تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔ کہو، بے شک میری نماز، میری قربانی، میری عبادت، میرا جینا اور مرنا، سب اللہ کے لیے ہے، جو رب العالمین ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اللہ کے فرماں برداروں میں سے ہوں۔

ملک کے موجودہ حالات

بزرگو، بھائیو، عزیزو، محترم خواتین، بہنو اور بیٹیو!

میں صمیم قلب سے آپ سب کو عیدالاضحیٰ کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

عید الفطر کے وقت ہمارے ملک کے جو حالات تھے وہی اس وقت بھی ہیں۔ دو ماہ دس دن بعد ان میں کوئی فرق نہیں واقع ہوا ہے، بلکہ حالات زیادہ ہی خراب رُخ اختیار کرتے جارہے ہیں۔ ملک میں لاقانونیت بڑھ رہی ہے۔ جس کے ہاتھ میں طاقت ہے وہ خود کو قانون سے بالاتر سمجھ رہا ہے۔ ہجومی تشدد [Mob Lynching] کے واقعات اسی کا نتیجہ ہیں۔ اقلیتوں اور کم زور طبقات کو جور و ستم کا ہدف بنایا جارہا ہے۔ خواتین کی عزت و آبرو اپنے گھر اور خاندان تک میں محفوظ نہیں ہے۔ ریپ کے واقعات روز افزوں ہیں، بے سہارا لڑکیوں کی پناہ گاہوں کے دروازے ہوس پرستوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ پوری دنیا میں خواتین سب سے زیادہ ہندوستان میں غیر محفوظ ہیں۔ ہم جنسی کو جواز فراہم کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ ملک بعض پہلوؤں سے ترقی کررہا ہے، لیکن معاشی عدمِ مساوات میں اضافہ ہورہا ہے۔ ملکی معیشت پر چند سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ امیر اور غریب کا فرق بڑھ رہا ہے۔ آزادیِ رائے اور اظہارِ خیال پر بندشیں ہیں۔

یہ سب کچھ ہماری نگاہوں کے سامنے ہورہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان حالات میں ہم مہر بہ لب رہیں اور خاموشی ہی میں عافیت سمجھیں؟

حالات کو سدھارنا ہماری ذمے داری ہے

اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اس ملک میں خود ہمارے مسائل ہیں اور بہت سنگین مسائل ہیں، جن کو حل کرنے میں ہماری توانائی صرف ہورہی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ نہ بھولیے کہ یہ ملک ہمارا ملک ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس کے حالات و مسائل سے بے تعلق نہ رہیں اور اسے غلط رخ پر نہ جانے دیں۔ ملک کے بگاڑ سے ہماری بے تعلقی اس کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی۔ اس کی خیر خواہی کا شدید تقاضا ہے کہ اسے صحیح رخ دینے کی سعی کی جائے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ ملک غلط رخ پر جائے گا تو ہم بھی اس کے نتائجِ بد سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد صحابۂ کرامؓ سخت آزمائشوں سے گزر رہے تھے۔قرآن مجید نے انھیں صبر وثبات اختیار کرنے کا حکم دیا، دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ آپ انھیں اپنے سے قریب رکھیں اوران کی تربیت کا اہتمام کریں:

وَ اصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَالۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ وَلَا تَعۡدُ عَیۡنٰکَ عَنۡہُمۡ ۚ تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ (الکہف:۲۸)

اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جمائے رکھو جو اپنے رب کو صبح وشام اس کی رضا کے لیے پکارتے ہیں۔ تمھاری نگاہیں حیاتِ دنیا کی زیب وزینت کی طلب میں ان سے ہٹنے نہ پائیں۔

برادرانِ محترم اور محترم خواتین!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب میں وہ ساری خرابیاں تھیں جو موجودہ دور اور ہمارے ملک میں پائی جاتی ہیں۔ ان حالات میں آپ کو حکم ہوا: قُلۡ اِنَّنِیۡ ہَدٰىنِیۡ رَبِّیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۬ ''کہو، بے شک میرے رب نے مجھے صراطِ مستقیم کی ہدایت کی ہے۔''

یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انسان اپنے لیے جو بھی راستہ نکالے گا وہ خامیوں سے پاک نہ ہوگا۔ اس سے زندگی لازماً غلط رخ اختیار کرے گی۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم سے، جو آپ کی اولین مخاطب تھی، کہا کہ تم راہِ راست سے منحرف ہو چکے ہو۔ زندگی کی پر پیچ راہوں میں صراط مستقیم کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے وہ مجھے دکھائی ہے، اسے اختیار کر کے تم اپنی زندگی سنوار سکتے ہو۔ یہ اللہ کا نازل کردہ دین ہے، جو پوری زندگی کے لیے راہ نمائی فراہم کرتا ہے۔ یہ دھوکا یا فریب نہیں، بلکہ اس کی بنیادیں انتہائی مضبوط ہیں۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے، جو توحید خالص کے علم بردار تھے اور اللہ کی عبادت میں یکسو تھے۔ وہ راستہ یہ ہے کہ آدمی پوری طرح خود کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کردے۔ اسی کا آپ کو حکم ہوا:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ○ (الانعام: ۱۶۲، ۱۶۳)

کہو، بے شک میری نماز، میری قربانی اور میری عبادت، میرا جینا اور مرنا، سب اللہ کے لیے ہے، جو رب العالمین ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اللہ کے فرماں برداروں میں سے ہوں۔

یہ بات دوسری جگہ ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ○ وَ اُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ○ (الزمر: ۱۱، ۱۲)

کہو، بے شک مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت اس طرح کروں کہ پورا دین اسی کے لیے خالص ہوجائے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا فرماں بردار ہوجاؤں۔

انسان جب اپنی پوری زندگی اس طرح اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیتا ہے تو اسے للّٰہیت اور خدا پرستی کی معراج حاصل ہوتی ہے اور وہ دنیا اور آخرت کی فوز وفلاح سے ہم کنار ہوتا ہے:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ○ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ○ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ○ (یونس: ۶۲-۶۴)

سنو! بے شک جو اولیاء اللہ (اللہ کے دوست) ہیں ان کے لیے نہ خوف ہوگا اور نہ وہ رنج وغم میں مبتلا ہوں گے۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا، ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی خوش خبری ہے۔ اللہ کے قانون میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہی فوز عظیم ہے۔

ہمارے کرنے کے کام

ہمارے کرنے کے دو کام ہیں:

ایک یہ کہ اسلام نے جو صراطِ مستقیم دکھائی ہے اس پر خود گام زن ہوں۔ اپنی پوری زندگی اللہ کے احکام کے تابع کر دیں۔ اللہ کے رسول جس طرح اعلان کرتے ہیں

'اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ' آپ بھی اس موقف میں ہوں کہ کہہ سکیں کہ اللہ کے دین پر عمل کرنے میں ہم سب سے آگے ہیں۔ آپ کا دین وایمان آپ سے زندگی بھر اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ (تمھیں ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم اللہ کے فرماں بردار رہو) یعنی جب بھی موت آئے تمھیں اللہ کا فرماں بردار پائے۔ سوچیے، کیا ہماری زندگی اس کا ثبوت فراہم کر رہی ہے یا یہ ہدایات صرف ہمارے لیے بحث اور گفتگو کا موضوع ہیں؟

دوسرا کام یہ کہ اللہ نے جو صراطِ مستقیم دکھائی ہے، دنیا کو اس کی دعوت دیجیے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ قف عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ○ (یوسف ۱۲:۱۰۸)

کہو، یہ میرا راستہ ہے۔ میں اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔ میں بھی پوری بصیرت کے ساتھ ہوں اور میرے ساتھی بھی، اور پاک ہے اللہ شرک سے (جس کا ارتکاب یہ کر رہے ہیں) اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

دوستو اور ساتھیو!

آج دنیا اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود ظلمت میں بھٹک رہی ہے۔ آپ اللہ کے عطا کردہ نورِ ہدایت کو عام کیجیے۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ جس ملت کے پاس اللہ تعالیٰ کا تابناک دین ہے، جو نور ہی نور ہے، جو آفتابِ ہدایت ہے، وہ دوسروں سے زندگی کا راستہ پوچھتی پھر رہی ہے۔ آپ دریوزہ گر بن کر نہ رہیے، پیکرِ جود وعطا بنیے۔ دنیا کے پیچھے چلنے والے نہیں، اس کے رہبر و راہ نما بنیے۔ یہی آپ کا صحیح مقام ہے۔ اس سے ملک بھی سیدھی راہ پر چلے گا اور آپ کے مسائل بھی حل ہوں گے۔ اللہ میری اور آپ کی مدد کرے۔

ملک کے حالات بدلنے کے لیے مسلمان آگے آئیں

ظلم وعدل دو لفظ ہیں۔ لیکن ان کے ذریعہ قوموں کی موت وحیات کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ظلم کے معنیٰ ہیں ناانصافی، غلط روی، حد سے تجاوز کرنا، جس چیز کا جو موقع ومحل ہے اسے دوسری جگہ رکھنا، اختیار کا غلط استعمال کرنا، کسی کو اس کے حق سے محروم کرنا۔ ظلم کے اندر ظلمت اور تاریکی کا تصور ہے۔ جب کوئی قوم ظلم کی راہ اختیار کرتی ہے تو اس پر تاریکی چھا جاتی ہے اور پھر وہ ابھر نہیں پاتی۔

عدل کے معنیٰ ہیں مساوات، ہر ایک کے ساتھ برابر کا سلوک کرنا، اسے اس کا حق دینا، راست روی اختیار کرنا۔ عادل اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کا دامن ظلم وزیادتی سے پاک ہو اور جو اپنے فیصلہ میں عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ آسمان اور زمین عدل پر قائم ہیں۔ اس میں فرق آجائے تو نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے۔ جو قوم عدل کا راستہ اختیار کرتی ہے اس پر ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

ملک کی موجودہ صورتِ حال

اس وقت ہمارے ملک کے جو حالات ہیں، جس طرح کے فیصلے ہو رہے ہیں، مختلف

سطح پر جو اقدامات کیے جارہے ہیں انھیں دیکھ دیکھ کر مجھ جیسے آدمی کا دل دکھنے لگتا ہے کہ یہ ملک غلط رخ پر چل پڑا ہے اور اسے باز رکھنے کی کوششیں فی الحال کام یاب نہیں ہورہی ہیں۔

اس ملک میں مسلمان بیس کروڑ کے قریب ہیں۔ انھیں اس ملک کا دشمن سمجھ لیا گیا ہے۔ مسلمان تو اس کا نقصان برداشت کرہی رہے ہیں سوال یہ ہے کہ کیا یہ اس ملک کے حق میں ہے؟

مسلمان اس ملک میں آزادی کے بعد سے مختلف مسائل سے دوچار ہیں، لیکن گزشتہ پانچ چھ سال سے وہ ایک طرح کے خوف وخطر اور اندیشہ کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ مسلمان اس ملک میں ایک ہزار سال سے رہ رہے ہیں اور اپنے خون جگر سے اس کی آب یاری کرتے رہے ہیں۔ آج ان سے ملک کی وفاداری کا ثبوت طلب کیا جاتا ہے۔ جیسے کوئی مسلمان ہے تو اس کا ملک کا وفادار ہونا ہی مشکوک ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ خدمت وہ انجام دے رہے ہیں جن کا ملک کی تعمیر میں کوئی حصہ نہیں ہے، سوائے وفاداری کے سائن بورڈ کے۔

ہجومی تشدد (Mob Linching) کے واقعات بڑھتے جارہے ہیں، مسلمان خاص طور پر اس کا ہدف ہیں۔ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ جہاں وہ ہیں، اپنی جگہ قیام پذیر ہوں یا سفر کررہے ہوں، کسی بھی حال میں کسی بھی بہانے ان پر یورش ہوسکتی ہے۔ یہ واقعات چند ایک ہی ہیں لیکن ہر طرف اندیشہ کی فضا چھائی ہوئی ہے کہ کسی کے ساتھ بھی اس طرح کا ناگوار واقعہ پیش آسکتا ہے۔

Mob Linching یا ہجومی حملوں کے خلاف کسی طرف سے کوئی آواز اٹھتی بھی ہے تو فضا میں تحلیل ہوکر رہ جاتی ہے، اس کے اثرات نہیں دیکھے جاتے۔

ملک میں امن وامان اور عدل وانصاف کا قائم کرنا حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ حکومت بعض اوقات اس کے لیے بیانات دیتی ہے اور قانون کے احترام کی طرف توجہ دلاتی ہے، لیکن اس کی سیاسی مصلحتیں اسے کوئی سخت قدم اٹھانے نہیں دیتیں اور وہ اس ماحول کو ختم نہیں کرپارہی ہے۔

مسلمانوں کی ذمے داری

مجھے اس وقت اپنے مسلمان بھائیوں سے کچھ عرض کرنا ہے۔ حالات یقیناً تشویش ناک ہیں، اسے آپ تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ خوف اور اندیشہ کے ماحول سے باہر آئیں اور ملک کو عدل وانصاف اور امن وامان کی راہ دکھائیں۔ آپ انصاف کی بھیک مانگنے والے نہیں، بلکہ ظلم سے نجات دینے والے بن کر سامنے آئیں۔

اس سرزمین پر جس کسی پر بھی ظلم ہو اس کی حمایت میں کمر بستہ ہو جائیں اور یہ نہ دیکھیں کہ ظلم کس پر ہو رہا ہے، کسی مسلمان پر ہو رہا ہے یا عیسائی پر، سکھ پر ہو رہا ہے یا بدھ مت کے ماننے والوں پر، کم زور طبقہ پر ہو رہا ہے یا اعلیٰ طبقہ کے افراد پر۔ آپ اس جذبہ اور عزم کے ساتھ آگے آئیں۔ ظلم بہر حال ظلم ہے، اسے ختم ہونا چاہیے۔

ایسا ماحول پیدا کیجیے کہ یہاں کا ہر مظلوم آپ کو اپنا ہم درد تصور کرنے لگے اور مشکل میں آپ کی طرف اس کی نگاہیں اٹھنے لگیں کہ یہ ہمارے خیر خواہ ہیں۔ یہ ہمیں بے یارو مددگار نہیں چھوڑیں گے۔

یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ اس نے ہمیں اور آپ کو اسی کا درس دیا ہے کہ اللہ کی زمین پر عدل وانصاف کا علم لے کر کھڑے ہوں۔ اس نے کہا کسی قوم سے تمھارے اختلافات ہو سکتے ہیں، اس نے تمھارے ساتھ زیادتی بھی کی ہوگی، لیکن تمھارے دلوں میں اس سے دشمنی کے جذبات نہ ہوں۔ کسی حال میں عدل وانصاف کا دامن تمھارے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (المائدہ:۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ، عدل وقسط کے گواہ بن کر۔ کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اسلام کی تعلیمات بیان ہی نہ کریں، بلکہ ان کا عملی نمونہ بھی پیش کریں۔ آپ کا کردار اسلامی ہو، آپ کے اندر صبر وضبط ہو اور آپ تحمل اور برداشت کا ثبوت دیں۔ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ آپ کے دامن پر بھی ظلم وزیادتی کے داغ دھبے ہیں۔

اتنی بڑی امت عزم وہمت اور حوصلہ کے ساتھ ظلم کے خلاف کھڑی ہو جائے تو ظلم کی راہیں خود بخود بند ہونے لگیں گی۔ اس سے بہت ممکن ہے کہ آج جو لوگ آپ سے بہت دور ہیں وہ قریب سے قریب تر ہو جائیں اور اسلام کو صحیح شکل میں سمجھنے کی راہیں کھل جائیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق دے۔

ملکی انتخابات اور اُمتِ مسلمہ کی ذمے داری

جمہوریت میں الیکشن ملک کا سیاسی رخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ حکومت کس پارٹی کی ہوگی اور وہ ملک کو کس طرف لے جائے گی۔ ہمارے ملک میں ۲۰۱۹ء میں الیکشن ہونے والے ہیں۔ خیال ہے کہ یہ بہت دوررس اثرات کے حامل ہوں گے۔ اس سے یہ فیصلہ ہوگا کہ ملک کا نظام کیا دستور کے مطابق چلے گا یا ایک خاص طبقہ اور ذہن کی یہاں حکم رانی ہوگی؟

الیکشن سے متعلق جماعت اسلامی ہند کے فیصلے

جماعت اسلامی ہند نے تین دہائی قبل دو اہم فیصلے کیے اور بار بار اس کی وضاحت بھی ہوتی رہی ہے۔

ایک یہ کہ ملک وملت کے اہم مفادات کے لیے جماعت الیکشن میں حصہ لے سکتی ہے۔ چناں چہ وہ ایک طویل عرصہ سے الیکشن میں بالواسطہ حصہ لیتی رہی ہے۔

دوسرا فیصلہ یہ کہ ڈکٹیٹر شپ اور فاشزم کے مقابلے میں جمہوری طاقتوں کی حمایت کی جائے گی۔ یہ کام بھی مسلسل ہوتا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جماعت

نے جمہوریت کو برحق اور اسلامی قرار دیا ہے، بلکہ اس کے نزدیک دوسرے نظاموں کے مقابلے میں یہ ایک بہتر نظامِ حکومت ہے۔ اس میں بنیادی حقوق کی دستوری ضمانت ہوتی ہے، جس میں اظہارِ خیال کی آزادی بھی شامل ہے۔ جمہوریت میں اسلام کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی راہیں نکالی جاسکتی ہیں۔

جمہوریت کی بنیاد فرد کی آزادی، مساوات اور عدل وانصاف پر ہے۔ فرد کی آزادی میں عقیدے، اس پر عمل اور اس کی تبلیغ کی آزادی، معاشی تگ ودو، خاندانی اور نجی زندگی کی آزادی جیسے امور شامل ہیں۔

مساوات کا مطلب یہ ہے کہ ملک کے ہر شہری کو برابر کی حیثیت دی جائے۔ ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان مذہب، ذات، زبان اور جنس کی بنیاد پر فرق نہ کیا جائے اور سب کے مساوی حقوق تسلیم کیے جائیں۔

عدل وانصاف یہ ہے کہ بغیر کسی تفریق کے ہر ایک کو انصاف حاصل ہو اور کسی کے ساتھ بھی ظلم وزیادتی روا نہ رکھی جائے۔

اسلام کے نزدیک ان اقدار کی اہمیت تسلیم شدہ ہے، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا نے یہ قدریں اسلام ہی سے اخذ کی ہیں۔

اس وقت یہ اعلیٰ اقدار بری طرح مجروح ہو رہی ہیں۔ خاص طور پر اقلیتوں اور کم زور طبقات کو ان کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ ملک کی خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ان اقدار کی حفاظت کی جائے اور انھیں باقی رکھا جائے۔

امت مسلمہ کا مسئلہ

ہمارے سامنے امت مسلمہ کا مسئلہ ہے۔ اس پر کسی قدر تفصیل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت امت مسلمہ میں دورِ اول کی معیاری اور مثالی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ اس میں بہت سی دینی اور اخلاقی کم زوریاں در آئی ہیں۔ کہیں کہیں اس کے فکر

میں انحراف بھی ہے، حکومت اور انتظامیہ کا خوف بھی اسے دامن گیر ہے کہ وہ ان کے حقوق کی محافظ نہیں ہے، بلکہ اس کے ہاتھوں اس کے حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ اس کے اندر تعلیمی اور معاشی پس ماندگی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے روزمرہ کے مسائل سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتی۔ وہ مختلف گروہی اور مسلکی طبقات میں بٹی ہوئی ہے۔ وہ پورے ملک میں بکھری ہوئی ہے، اس کا کوئی متحدہ پلیٹ فارم نہیں ہے کہ اس کی مشترکہ آواز ہو، اس کی وجہ سے اس کے اندر مایوسی اور بددلی بھی دیکھنے میں آتی ہے، جو ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس امت کا اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان ہے۔ انہی کو وہ آخری سند تسلیم کرتی ہے، اساساتِ دین پر اس کے درمیان اختلاف نہیں ہے، اس کے مفادات ایک ہیں۔ قرآن و حدیث میں اسے ایک امت قرار دیا گیا ہے۔ دنیا بھی اسے ایک امت ہی مان کر اس کے ساتھ معاملہ کرتی ہے۔ اس وجہ سے اس کی جان و مال کا تحفظ، اس کی اصلاح و تربیت، اس کی تعلیمی اور معاشی ترقی، اس کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے۔ الیکشن میں یہ سب مقاصد پیش نظر ہوتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کی دعوتی واصلاحی سرگزشت

قرآن مجید نے حضرت موسیٰؑ کی جو دعوتی اور اصلاحی سرگزشت بیان کی ہے، اس کے بغور مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اس سے راہ نمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس سرگزشت کو تین عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ فرعون کو اللہ تعالیٰ کی فرماں روائی تسلیم کرنے اور اس کے مطابق اپنی اصلاح کی دعوت۔ حکم ہوا:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ○ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ○ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ○ (النازعات: ۱۷ تا ۱۹)

جاؤ فرعون کے پاس۔ اس نے سرکشی کی (راہ اختیار کی) ہے۔ اس سے کہو، کیا تم اس کے لیے تیار ہو کہ تمھارا تزکیہ اور اصلاح ہو اور میں تمھارے رب کا راستہ تمھیں دکھاؤں۔ تم اس سے ڈر کر چلو۔

۲۔ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکالنا۔ بنی اسرائیل ایک بگڑی ہوئی قوم تھی۔ اس کے اندر صدہا خرابیاں تھیں۔ اس کے ساتھ وہ مظلوم تھی، قبطی ان پر ہر طرح کا ظلم روا رکھے ہوئے تھے۔ فرعون نے طے کیا:

سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ○ (الاعراف:۱۲۷)

ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں (لڑکیوں) کو زندہ رکھیں گے۔ ہمیں ان پر پوری قدرت حاصل ہے۔

فرعون کے اذن کے بغیر بنی اسرائیل اپنے عقیدے کا بھی اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ جادوگروں نے حضرت موسیٰؑ پر ایمان کا اعلان کیا تو فرعون نے کہا: یہ جرأت تمھیں کیسے ہوئی؟

اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ (الشعراء:۴۹)

میری اجازت سے پہلے ہی تم اس پر ایمان لے آئے (اس کی سزا میں تمھیں دوں گا)۔

ان بدترین مظالم کے خلاف آواز اٹھانے اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کا حوصلہ بنی اسرائیل کھو چکے تھے۔ طویل عرصہ کی غلامی نے ان کے اندر سے عزم و ہمت، جرأت اور پامردی، جیسے اوصاف جو کسی قوم کا سرمایہ حیات ہوتے ہیں، ختم کر دیے تھے۔

اس بزدل اور کم ہمت قوم کے بارے میں حضرت موسیٰؑ کو ہدایت دی گئی کہ وہ اسے فرعون کے جور و ستم کے شکنجہ سے نکالیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے کہا:

فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ (طٰہٰ:۴۷)

بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو اور ان کو عذاب نہ دو۔

۳۔ حضرت موسیٰؑ کا تیسرا کام بنی اسرائیل کی اصلاح اور اسے ایک حاملِ کتاب قوم بنانا تھا۔ اس راہ میں ان کی کیا کوششیں تھیں اور انھیں کتنی تکالیف برداشت کرنی پڑیں، اس کی تفصیل قرآن مجید میں ہے۔ یہاں ایک مثال دی جا رہی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا:

اِسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ○ (الاعراف:۱۲۸)

اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر کرو۔ بے شک زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس کا وارث بناتا ہے۔ اور انجام کار متقیوں ہی کے لیے ہے۔

ایک ایسی قوم جو صدہا سال سے غلامی اور محکومی کی زندگی گزار رہی تھی اس کے اندر یہ احساس پیدا کرنا آسان نہ تھا کہ فرعون کے اقتدار سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں، اقتدار آج ایک ہاتھ میں ہے، کل دوسرے ہاتھ میں ہوسکتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کیا جائے اور صبر وثبات کا ثبوت دیا جائے۔فکر کی اس بلندی کا اس قوم کے لیے تصور ہی مشکل تھا۔اس نے کہا:

أُوذِينَا مِن قَبْلِ أَن تَأْتِيَنَا وَمِن بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۝ (الاعراف:۱۲۹)

تمھارے آنے سے پہلے بھی ہمیں اذیت دی جارہی تھی اور تمھارے آنے کے بعد بھی ہم اذیت ہی میں گرفتار ہیں۔موسیٰؑ نے کہا: وہ وقت دور نہیں، جب کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کردے اور زمین کا تمھیں وارث بنادے اور دیکھے کہ تمھارا عمل کیا رہتا ہے؟

چناں چہ ایک وقت آیا کہ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو مصر سے نکال کرلے جانے میں کام یاب ہوگئے۔اللہ تعالیٰ نے بحر قلزم میں ان کے لیے راستہ نکال دیا اور فرعون کا لشکر اسی سمندر میں غرق ہوگیا۔حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو ارضِ فلسطین میں آباد کیا۔

امت مسلمہ میں کرنے کے کام

فرعون اور حضرت موسیٰؑ کی کش مکش اور بنی اسرائیل کے واقعات کا پوری طرح انطباق ہندوستان کے حالات میں ممکن نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر اس کی روشنی میں ہمارے کرنے کے دو کام ہیں۔ایک یہ کہ مختلف اسباب کی وجہ سے امت کے اندر ایک طرح کی مایوسی، دل شکستگی اور عدم تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے، جو سخت نقصان دہ ہے۔ ضرورت ہے کہ مایوسی کی اس کیفیت کو ختم کرنے اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا عزم و حوصلہ اس کے اندر پیدا کیا جائے۔ ساتھ ہی اس بات کی کوشش کی جائے کہ اس کے دستوری حقوق اسے حاصل ہوں، اسے تعلیمی اور معاشی لحاظ سے اوپر اٹھانے کی تدابیر اختیار کی

جائیں اور اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ ملک میں اپنا مثبت رول ادا کر سکے۔اس کے لیے ملکی فضا جتنی بہتر ہوگی، اتنے ہی مواقع حاصل ہوں گے۔ جمہوریت اس کے نسبتاً زیادہ مواقع فراہم کرتی ہے۔

دوسرا کام امت کی اصلاح و تربیت کا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ امت میں دین کا علم عام ہو اور اس پر عمل کا جذبہ اس کے اندر بیدار کیا جائے، اس کے دینی تشخص کو باقی رکھا جائے، پرسنل لا کی حفاظت کی جائے اور اس پر عمل کی ترغیب دی جائے کہ وہ کم از کم اپنے عائلی اور خاندانی معاملات میں احکامِ الٰہی کی پابند رہے، اس کے اندر خیرِ امت ہونے کا شعور بیدار کیا جائے کہ وہ دینی اور اخلاقی لحاظ سے دوسری قوموں سے ممتاز نظر آئے اور دنیا کو راہ راست دکھائے، اس کے ذریعہ معروفات کا قیام اور منکرات کا ازالہ ہو۔ یہ دونوں ہی کام دینی کام ہیں اور ان کے لیے سعی و جہد خدمتِ دین متصور ہوگی۔

موجودہ ملکی حالات کا تقاضا ہے کہ حسب ذیل امور انجام دیے جائیں:

۱- اس بات کی کوشش کی جائے کہ ملک میں قانون کی بالادستی قائم ہو، خوف اور دہشت کا ماحول ختم ہو، سب کو برابر کے حقوق حاصل ہوں، کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ اس کے لیے ملک میں جو طاقتیں سرگرم ہیں، ان کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

۲- سیاسی جماعتوں سے گفت و شنید کی جائے کہ ملک میں بہتر سیاسی فضا کے لیے ان کے درمیان ربط و تعاون ہو اور وہ مناسب اقدامات کریں۔

۳- کوشش کی جائے کہ سیاسی اور مذہبی قائدین ایسے بیانات اور اقدامات سے احتراز کریں جو عصبیتوں کو بھڑکاتے یا عوام میں منفی رجحانات ابھارتے ہیں۔

۴- میڈیا اور سوشل میڈیا پر نظر رکھی جائے کہ وہ غلط اور گم راہ کن خبریں نہ پھیلائے اور بروقت صحیح خبروں اور تجزیوں کا اہتمام کیا جائے۔

۵- ملک سے نفرت اور عداوت کا ماحول ختم کرنے اور انسانی اخوت اور ہم دردی کا

ماحول پیدا کرنے کی تحریک چلائی جائے۔F.D.C.A اور جن مورچہ کو ملکی سطح پر زندہ کیا جائے۔اور مقامی سطح پر سدبھاؤنا منچ کو متحرک کیا جائے۔

۶- برادرانِ وطن سے بڑے پیمانے پر رابطہ کیا جائے اور انھیں فرقہ وارانہ منافرت کے نتائج سے آگاہ کیا جائے اور مختلف طبقات میں اتحاد اور یک جہتی کے لیے مؤثر کوشش کے لیے آمادہ کیا جائے۔

۷- مسلم تنظیموں اور قائدین سے رابطہ بڑھایا جائے کہ وہ فرقہ وارانہ سیاست کے خلاف متحدہ کوشش کریں۔

۸- ملت کے اندر سیاسی شعور بیدار کیا جائے،اس کی طاقت کو مجتمع کیا جائے،اس کی صفوں میں اتحاد پیدا کیا جائے اور اسے صحیح رخ دینے کی کوشش کی جائے۔

امید ہے اس سے حالات کو بہتر بنانے اور جمہوری فضا قائم کرنے میں مدد ملے گی۔
